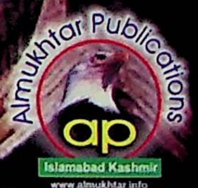
تحریریں

............عرقِ انفعال کے قطرے کو موتی بنانے والے تخلیق ساز کے سامنے ہماری اور

ہمارے حقیر سے قلم پاروں کی کیا وقعت...وہ جو تخلیق کرتا ہے اُس میں خامی تلاش کرنا تو

دور کی بات اُسے سمجھنے کی بصیرت بھی آدم میں نہیں......کچھ قلمکاروں کی تحریروں میں

زاہد مختار



تحریریں

زاہد مختار

☆ نام کتاب: تحریریں

☆ مصنف: زاہد مختار

☆ پہلا ایڈیشن ۲۰۰۹ء

☆ کمپوزنگ: المختار پبلی کیشنز نئی بستی اسلام آباد کشمیر

☆ قیمت ؛ تین سو روپے (Rs 300/-)

☆ سرورق: عادل مختار

☆ طباعت: رہبر آفیسٹ دہلی

کتاب ملنے کا پتہ:

☆ کتاب گھر (کلچرل اکادمی سرینگر) لال چوک سرینگر

☆ کتاب گھر (کلچرل اکادمی جموں) کنال روڈ جموں

☆ المختار پبلی کیشنز، نئی بستی اسلام آباد کشمیر

''اس کتاب کی طباعت کیلئے جموں و کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز سے مالی امداد حاصل کی گئی ہے۔ اس کتاب میں ظاہر کی گئی آرأ سے کلچرل اکادمی کا بلواسطہ یا بلاواسطہ کوئی تعلق نہیں اور نہ اِس ضمن میں کلچرل اکیڈمی پر کوئی ذمہ داری عاید ہوگی''

زاہد مختار:

فون نمبرات: 9419043499 9797005555. 9906606555

اِنتسابؒ

ماںؒ

کے نام

جس کے بغیر

تصورِ انسانیت نامکمل ہے

زاہدؔ مختار

دعا

مدت سے بھٹکی چھاؤں ہے کوئی چنار دے
مولیٰ مری زمین کو پھر سے بہار دے
جہلم کے لب ہیں پیاس کے صحرا لہو میں تر
ٹھنڈی ہوا سکون کی اِک آبشار دے
پھر زعفران کے کھیت میں خاتوں ہو نغمہ زن
خوشبو کو پھول ، پھول کو اِک لالہ زار دے
آتش مرے ضمیر میں ہے اب بھی مُضطرِب
خاکِ وطن کو پھر وہی حسن و وقار دے
پھر چاندنی کے نور میں نہلائیں بستیاں
سورج کو ڈل کا وہ حسین قرب و جوار دے
آیت کو پھر ملے کوئی معصوم سا دہَن
ہر اِک نگاہ کو پھر وہی روشن مِنار دے

ورق ورق:

تصدیر:

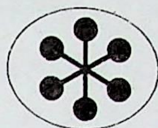
تخلیق (افسانے)

تنقید (تبصرے و تجزیے)

جرأت (لفظ لفظ گفتگو)

تصدیر

حرفؔ حرفؔ آواز



جہلم کے کنارے پر اکثر میں جلتا بُجھتا رہتا ہوں
موجوں کی روانی سنتا ہوں ، قطروں کی کہانی لکھتا ہوں
آنچل میں چھپائے رکھتی تھی میری ماں میرِے ننھے بچپن کو
اب پُرزے پرزے اُڑتا ہے، اب تنکے تنکے بہتا ہوں

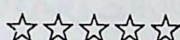
زاہدمختار



قرآن پاک میں ارشاد ہے ''میں نے رات اور دن کے ہونے میں عقلمندوں کے لئے نشانیاں رکھی ہیں''

قانون قدرت سے انحراف کر کے جو بھی اپنے ''علمی نقطے'' پر بحث کرنے کی گنجائش پیدا کرتا ہے وہ شاید اس بات کا ادراک نہیں رکھتا ہے درخت، ندی، کوہ و چمن کا وجود انسانی خصلت و فطرت سے الگ خود اپنی سرحدوں میں پھل پھول رہا ہے۔ گرد کی فطرت میں جہاں آلودگی کا عنصر بھی شامل ہے وہیں ہوا کی فطرت میں سرد و گرم تاثیر بھی۔ صابن کی ایک معمولی ٹکیہ خود بھی نہاتی ہے اور انسانی جسم کے تطہیری عمل میں اُسکی معاون بھی ثابت ہوتی ہے۔ گیہوں کی ایک بالی خود بھی زمین سے اپنے لئے غذا تلاش کر کے جہاں اپنی بھوک مٹاتی ہے وہیں ہمیں بھی روٹی کا ایک تحفۂ حیات پیش کرتی ہے۔ شبنم کا ایک قطرہ سورج کی شعاعوں میں فنا ہونے سے پہلے ہر صبح پھول کے چہرے کو دھونے کا عمل دہراتا ہے،۔ آگ کا تصور ہی غیر یقینی ہوتا اگر آگ سے جلنے والی اشیا اپنا دامن جلنے کے لئے پیش نہ کرتی۔ تریاق بھی زہر کے بِنا اپنے ہونے کا ثبوت فراہم نہیں کر پاتا دراصل قدرت نے ہر چیز کو دوسری چیز سے فطری اور شناختی طور الگ الگ بنا کر جمالیاتی سفر میں انسان کو مسافر کا درجہ دیا ہے۔ سفر کا نہیں۔ تماشا، تماشائی کا مرہون ہے۔ رنگ نظر کا، حسن عشق کا اور دل جذبے کا۔ ان کا موازنہ کرنا قانون قدرت سے انحراف ہے۔ کائنات سے فرار ممکن نہیں۔ بادل و بارش، برق و باراں، برف اور ندی،

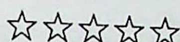
شبنم اور صبا۔ شجر و ثمر کے وجود کو انسانی نقطہ نظر کے حصار میں قید کرنا فہم و ادراک سے عاری سوال کے مترادف ہے مثلاً یہ کہ ہوا مٹھی میں بند کیوں نہیں ہوتی ؟ پھر تو ایک ٹھوس شئے کی افادیت ہی ختم ہوگی۔ ہوا کے ایک اہم جز آکسیجن کا اپنا حلیہ اور اپنا مقام ہے جبکہ ایک ٹھوس دوائی کی ٹکیہ کا بھی اپنا ایک الگ مقام۔ اب ٹکیہ سے یہ سوال کرنا کہ کیا وہ خود کبھی بیمار ہوتی ہے؟ آکسیجن سے یہ سوال کرنا کہ کہیں اُسے کبھی سانس پھولنے کی شکایت تو نہیں ہوتی ایک منطق کی تلاش نہیں۔ رہی بات وجود کی، آلودگی کی، یہ دھلتا کون ہے اور دھوتا کون ہے۔ غسلِ واجب میں پورے انسانی جسم کو دھونے کا حکم ارتقاً آدم کی تواریخ میں رقم ہے۔ پانی دوسروں کے تطہیری عمل میں خود کبھی ناپاک نہیں ہوتا بشرطیکہ متحرک رہے۔



.........عرق انفعال کے قطرے کو موتی بنانے والے تخلیق ساز کے سامنے ہماری اور ہمارے حقیر سے قلم پاروں کی کیا وقعت...وہ جو تخلیق کرتا ہے اُس میں خامی تلاش کرنا تو دور کی بات اُسے سمجھنے کی بصیرت بھی آدم میں نہیں۔....کچھ قلمکاروں کی تحریروں میں رہبانیت ہوتی ہے رہبری نہیں۔ وہ ایک خشک مشاہدے کا صُور پھونکتی ہوئی نظر آتی ہیں، جستجو اور جدوجہد کی ترغیب دیتی ہوئی نظر نہیں آتیں۔ وہ قدرت کے نظاروں سے مدہوش ہونے کا عندیہ دیتی ہیں اُن پر غور و فکر کرنے کی دعوت نہیں دیتی اور یہیں پہ اختلاف کی گنجائش نکلتی ہے۔ کیونکہ بذات خود انسان بھی قدرت کے اسی نظام کا ایک جز ہے۔ آدم اُن تمام چیزوں سے جدا نہیں جنہیں چشم بینا دیکھتی ہے اور غور کیا جائے تو

قدرت کی ہر شئے فقط تماشا نہیں، ایک خاموش منظر نہیں، صرف ایک دید نہیں بلکہ خود میں پنہاں ایک دعوت ہے۔ ایک ترغیب ہے، ایک فکر ہے، ایک ولولہ ہے۔ ایک تغیر وتبدل کا آئینہ ہے، ایک جستجو ہے، ایک لامنتہائی سلسلہ ہے جو ایک پیڑ کو بھی خزاں اور بہار کی آمد و رفت کے دوران لذت و کرب کی ہزار ہا منزلوں سے گزارتا ہے۔ غور کیا جائے تو ایک شاخ پہ کھلے ہوئے پتے صرف روح ونظر کو سکون ہی فراہم نہیں کرتے بلکہ اُن کے کھلنے کا سلیقہ۔ اُنکی ایک منظّم قطار، اُن کے خوبصورت رنگ، اُن کے فطری لباس کی نقش ونگاری غور وفکر کی وادیوں میں بھی پہنچاتی ہے اور جب اُن وادیوں میں ایک قلمکار، ایک مصور، ایک شاعر یا ایک تخلیقی قوت رکھنے والا صاحب قلم اپنی آنکھیں کھولتا ہے تو اُسے وہاں پتوں کی خاموش سرسراہٹ کے بجائے تجسُس کی طُغیانی اور طلب العلم کے طلاطم سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ وہ اُداسی اور مسرتوں کے ہزار ہا مرحلوں سے بھی گزرتا ہے اور جب وہ ان لمحات کے طلسم سے آزاد ہوتا ہے تو اُسکے سامنے اُسکی تحریر، اُسکی تخلیق، اُسکا تجربہ، اُسکا مشاہدہ، اُسکے تمام تر احساسات لئے جلوہ گر ہو چکا ہوتا ہے اور یوں اُسکی تخلیق میں فطرت کے سارے رنگ شامل ہوتے ہیں۔ سیاہ وسفید کا عکس ہوتا ہے۔ درد والم کی لکیریں ہوتی ہیں کیونکہ ہر شئے میں یاسیت، مسرت، سکون، خاموشی، لذت حیات اور تلخی موت کا عنصر شامل ہے اور یہ جذبے کھلی آنکھ سے دیکھے نہیں جاتے، روح کی گہرائیوں میں محسوس کئے جاتے ہیں۔ سمندر کے ساحل پر بیٹھ کر سمندر میں چھپے ہوئے طوفان کے تھپیڑوں کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ اس بات سے شاید کسی کو اختلاف نہ ہو کہ تحریریں مشاہدوں کی مرہون ہوتی ہے اور مشاہدے فطرت سے ہی اُبھرتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ کوئی خوبصورت پتوں کے اُوپری حسن میں کھو جاتا ہے اور کوئی اِس حسن کے محیط

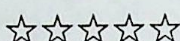
بیکراں میں ڈوب کر گوہر کی تلاش میں کھو جاتا ہے۔صرف تماشائی بننا زندگی نہیں۔
راستے تکنے سے منزل نہیں ملتی۔منزل پانے کے لئے آبلہ پائی شرط اولین ہے.........



ایک قلم کار نے ایک بار یہ بھی لکھا تھا کہ ''خدائی جنت ایک تصور ہے اور کشمیر واقعی ایک جنت'' ہم نے کہا خدا کے بارے میں یہ عقیدہ رہنے دیجئے کہ نعوذ باللہ خدا جھوٹ نہیں بولتا ہاں ایک مغل شہنشاہ جو کشمیر کو اپنی عیاشی کی آماجگاہ بنانے میں یقین رکھتا تھا (دروغ برگردن راوی) کتنا سچ اور کتنا جھوٹ بول چکا ہے اس بارے میں ہم بھی کچھ کچھ حقیقت حال سے واقف ہوئے ہیں کیونکہ اصل تاریخ تو حکمرانوں کے اِنتِم سنسکار کے بعد ہی منظر عام پہ آتی ہے۔بہر حال کسی انسان کے قول کو عقیدہ نہیں بنایا جا سکتا کیونکہ شدّادؔ نے بھی ایک جنت بنانے کا دعویٰ کیا تھا۔

دراصل انسان کی بسائی ہوئی ''جنت'' کو جلانے والا ادب سماج، سیاست اور نہ جانے کن کن شعبوں کا ''سفید پوش'' ہے جنکی اُجلی قبائیں نہ جانے کس کس کے خون سے رنگین ہونے کے بعد Bleach کی گئی ہیں۔دراصل ہمیں نفسیاتی طور الگ الگ خانوں میں بانٹ کر ہماری ''ماں'' کے لہو اور جسم کو بیچنے کا اہتمامِ خشک وتر کیا گیا ہے ورنہ گرم گوشت کے ان بیوپاریوں کو آپ کس فہرست میں رکھیں گے جو بڑے عہدوں پر براجمان ہیں اور خاک اور خون کا کھیل ختم ہونے کے متمنی نظر نہیں آتے.... ہمیں احساس کہ ''ماں'' کے ہاتھ میں اب دعاؤں کے سوا کچھ بھی نہیں لیکن ماں کے ایک لختِ جگر کے

مسکن پر کس نے کس طرح اپنا تسلط قائم کرنے کا حربہ آزمایا۔ کون ہے جو ہجرت کو تقدیر کا ایک آخری فیصلہ سمجھ کر اپنی دھرتی ''جنم بومی'' کے اُس ٹکڑہ جنت کو دلالوں کے ہاتھوں بیچ کر خود اس ''سورگ'' سے ہمیشہ کے لئے اپنا ناطہ توڑ چکا ہے؟۔ کون ہے جو اس دہائی میں اپنی غریبی کو امیری کا شاہانہ لباس پہنا کر قوم کے غم میں ڈنر کھاتے ہوئے اپنے لئے ڈیڑھ گز کی الگ جنت بنا چکا ہے؟........



میرا یہ ماننا ہے کہ اُردو زبان کے تئیں مخصوص لوگوں کی نفرت یا اردو والوں کو نیچا دکھانے کا جذبہ اُتنا جان لیوا نہیں ہوسکتا جتنا خود اردو سے اپنا رشتہ جتانے والوں کی گروہ بندی۔ میں بھی ایک عرصے سے ایک تماشائی کی طرح ادب میں ہو رہی زیادتیوں، نئی ادبی پود کے تئیں سرد مہریوں اور ادب کے تخت پہ براجماں ''ادبی چنگیزوں'' کی ظالمانہ روش کا مشاہدہ کر رہا ہوں اور مجھے یہ کہنے میں خود عار محسوس ہوتا ہے کہ ہم خود ہی اپنی اس پیاری پیاری زبان کے نازک گلے پر چھری چلانے کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ اپنے اسلاف سے دوری ہمیں بھی گوارا نہیں لیکن اپنے نئے کارواں کی دل شکنی بھی سود مند ثابت نہیں ہوسکتی۔ غالبؔ، جوشؔ، اقبالؔ، مومنؔ، داغؔ، منٹو، عصمتؔ یا پریمؔ چند، فیضؔ، قتیلؔ یا ایسے دیگر سینکڑوں نام چراغ راہ ہیں لیکن راہوں پہ صرف چراغ جلا کر کسی نئے کارواں کا پتہ نہیں ملتا۔ ادب کی نازک گلیوں میں اپنی روشنی بکھیرتے ہوئے اِن چراغوں کو بھی ایک نئے راہ رو کی تلاش ہوگی اور جب ایک منفی سوچ، گروہ بندی کا ایک

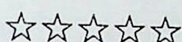
وحشی حِصار نئی آوازوں اور نئی جہتوں کو صَرفِ نظر کرنے کی روش اپنا کر اِن راہوں کو ہی اپنی جاگیر سمجھے تو پھر کیسا واویلا اور کیسا احتساب۔ احتساب تو اُس روش کا ہونا چاہئے جسکے تحت میڈیا کے سربراہوں کی کتاب یا صاحب اقتدار کے رشتہ دار کی ایک مختصر فنکاری کو اُن سینکڑوں جہتوں اور آوازوں پر فوقیت دی جاتی ہے جن سے ''زرخیز زمینیں نم ہوتی ہیں جس ادب کی خمیر میں منصب کی پزیرائی کا کیڑا اُگلبلا رہا ہو اُس زمین سے کونپلیں پھوٹنے کا تصور بھی دیوانے کا خواب ہے۔ اب اگر ان اَسناد و اعزازات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے رِسالوں اور اخبارات کے ادبی صفحوں کا ذکر کریں۔ قومی سطح کے مشاعروں کا جائزہ لیں تو یہ بات اور بھی دل شکن ثابت ہوگی کہ ایک سیاسی پارٹی کے قصیدہ خواں کو قومی مشاعرے میں ایک پوری ریاست کی نمائندگی کا اعزاز بخشا جاتا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ اُردو کا کھانے والے، اُردو کا پینے والے، اُردو کے نام پہ اپنا نام چمکانے والے اور اُردو، اُردو کی دہائی دینے والے جب اِن ''اُردو دشمن سرگرمیوں'' میں خود شامل ہوتے ہیں، جب ان ''ببول کے پیڑوں'' کو اپنی زرخیز زمین پہ بونے والے ہم خود ہی ثابت ہو رہے ہیں تو پھر اردو کے طالب علموں کو احساسِ کمتری کا شکار بنانے والوں سے کیا گِلہ۔۔ یہ گھر تو خود گھر کے ہی چراغ سے جل چکا ہے۔ قومی اردو کونسل کے بینر اردو کے بجائے انگریزی میں ہمارا مذاق اُڑاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جب ایک نامور مصنف سے ملاقات کی آڑ میں سیاسی چمچوں اور ادب سے نابلد افراد کو دعوت نامے ارسال کئے جاتے ہیں، تب ہمیں سانپ کیوں سونگتا ہے، تب ہمارا قلم معیار کی دہائی کیوں نہیں دیتا۔ بات زندگی کے محدود نظریے کی نہیں، ادیب تو کسی نظریے کا قائل ہوتا ہی نہیں۔ اُس کے قلم میں دم ہو تو وہ اپنا نظریہ خود تشکیل دیتا ہے لیکن اردو ادب کو ''محدود'' کرنے کا ''گناہ''

جن لوگوں سے سرزد ہورہا ہے اُن کا محاسبہ کون کرے۔ اردو کو صرف خوبصورت شاعری تک محدود کرنے کا ''فتویٰ'' جاری کرنے والے افراد کامیاب کیوں ہورہے ہیں صرف اس لئے کہ ہمارے اکثر اچھے اور نئے قلمکار اپنے قلم کی کاٹ سے، اردو زباں کی روانی سے اور خود اپنے اندر چھپے اُس شرر سے ناآشنا ہیں اسی لئے یہ کارواں سورہا ہے اور میں اس بات کا قائل ہوں کہ ''اب اور زیادہ سونا موت کی علامت ہے''

بات صرف اردو کے طالب علم کے ہی مستقبل کی نہیں ہے بات خود اردو زبان کے مستقبل کی ہے کیونکہ جب زبان ایک ''لونڈی'' کی طرح چند لوگوں کے دیوان خانوں میں ''قید'' کردی گئی ہو تو آبلہ پائی کا جنوں رکھنے والا طالب علم اپنی چھت کی فکر کرے کہ سنگلاخ دیواروں کو ڈھانے کا عزم.؟.........اس زبان کو جنہوں نے پیشہ بنایا ہے وہ کتنے دردمند، مخلص اور غیر جانبدار ہیں۔ کیا اردو زبان کی ترقی و تقدیم کا دعویٰ کرنے والے ادارے، اردو زبان میں شایع ہونے والے رسائل، اردو زبان کے نام پر منعقد ہونے والے سمینار اور مشاعرے۔ اردو کے نام پر دیئے جانے والے ایوارڈ، سب خلوص نیت کے ضامن ہیں؟ اب ڈگریوں کے حصول میں بھی روزگار کی پیاس کا عنصر غالب ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ اب ''انگلش میڈیم'' کا دور، عفریت بن کر ہماری نئی پیڑی کے منہ سے اردو کے نوالے چھین رہا ہے...میں تو پشتنی ایک کشمیری ہوں، سائنس کا طالب علم رہا ہوں لیکن مجھے اردو سے محبّت ہے جنون کی حد تک محبّت اور شاید اسی لئے میں نے اسٹیتسکوپ چھوڑ کر قلم ہاتھ میں لیا ہے لیکن کیا اردو زبان کے نام پر جاری ''ریشہ دوانیاں'' اور ''قلمی جاگیرداروں'' کا تسلط میرے بچے کو اردو کی جانب راغب ہونے سے نہیں روکے گا؟ جب ''اُستادفن ہی ''خانوں'' میں بٹا ہو تو طالب علم کو

کس حسین سانچے میں ڈھالا جاسکتا ہے۔

ضرورت اُن گوشوں کو ''عریاں'' کرنے کی کوشش کی ہے جن کی آڑ میں ''عصمتِ اردو'' سے کھلواڑ ہو رہا ہے تو شاید طالب علم یہ جان پائے کہ مٹی بھی نم ہے، زمین بھی زرخیز ہے اور دہقان بھی حوصلہ منداور باغیرت ورنہ خدانہ کرے کہ طالب علم اردو کے تئیں غیر سنجیدہ ہو کر احساس کمتری کے زیرِ اثر اس کھیت کے خوشہ گندم کو جلانے کا مرتکِب نہ ہوجائے۔



دردناک اور لہولہوتر لمحات میں ہی ہمارا ذہن ودل، ہمارا قلم اور قرِطاس ہم سے کچھ مانگتا ہے۔ اگر ہم ایک صدمے سے اُبھر کر سامنے نہیں آتے تو پھر ہمارا سکوت ہمیں بھی گناہ گاروں کی صف میں کھڑا کردے گا۔ پچھلے دنوں میرے ایک دوست نے ایک خط میں لکھا تھا کہ زاؔہد، تم ہنوماؔن کی طرح اپنی طاقت کو نہیں پہچانتے' اور میں نے بھی واپسی کے خط میں نہ جانے کیا کیا لکھا تھا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ بہت بکھرا ہوں یوں ہی بے مقصد۔ ہنوماؔن تو پھر بھی لنکا کو جلا کر سیتاؔ اور راؔم کی رامائین میں ایک کردار بن کر امر ہوا۔ میں اس ٹی وی۔ ریڈیو۔ اخبارات کی دنیا میں ہنوماؔن تو دور زاؔہد بن کر بھی کچھ نہ کر سکا۔ چاپلوسی اور رشوت خوری کے اس عالم میں مجھے نہ لنکا جلانی آئی اور نہ ادب کی سیتاؔ کو ہی چھڑا کر لا سکا۔ اب اس دھرتی پر کوئی راؔم نہیں رہتا اُسے تو آر ایس ایس اور ایسی ہی کٹر پرست تنظیموں نے ایودھیا میں اُسی دن پھر ایک بن باس پر روانہ کر دیا تھا جب سیکولرازم کے ستون گرے تھے۔ بھائی چارے کی فضا میں دھول اُڑی ہے۔ ہم اُس دیس کے واسی

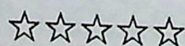
ہیں جہاں آج بھی زمین پر مندر اور مسجد کے جھگڑے میں خدا اور بھگوان کہیں نظر نہیں آتا ایسے میں ہم قلم کے قیدی کن شیدائیوں کو ڈھونڈ رہے ہیں۔

اچھی کہانیاں بچپن میں ''پادشاہ دلیل'' کے عنوان تلے سنی تھیں اب کتابوں میں ورق گردانی کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ہمارے ہاں ایک اچھی مثال ہے کہ ایک فرشتہ جو ایک پیغمبر کے پاس خدا کا فرمان لے کر آتا تھا جب پیغمبر صاحب کے اس دنیا سے رخصت ہونے کے وقت تشریف لایا تو پیغمبر صاحب نے اُس سے پوچھا کہ میرے بعد تم اس دھرتی پر پھر کبھی آؤ گے تو اُس نے جواب دیا ہاں دس بار۔ پہلے حیا، لے جاونگا۔ پھر ایمان۔ پھر اخوت، پھر محبّت۔۔ یوں ایک ایک کر کے سب اچھی چیزیں لیکر جاونگا اور آخر میں انسان سے انسانیت لے جاونگا۔۔۔



......ایک جانب میری وادی کا فن بتدریج اُبھر رہا ہے۔ زعفران کے پھولوں کی مہک لئے۔ جھیل ڈل کی خاموشی لئے۔ چنار کی آتشیں تاثیر لئے، برفیلی پہاڑوں کی عظمت لئے اور لہلہاتے کھیتوں کی شوخی لئے وہیں دوسری جانب.......

.........فنکاروں کا ایک ناتمام سلسلہ طول پکڑ رہا ہے لیکن فن مقیّد۔ سوچ کے دائیرے محدود اور تخلیقی قوت عنقا۔ جو کچھ لکھا گیا وہی دہرانے کا عمل زیادہ۔ فنون لطیفہ کو زندہ رکھنے والی محفلیں چند خانوں میں بٹی ہوئی ایک خیمہ زن کارواں کی دلخراش داستان اور شاید میری وادی کا قلمکار، فنکار اور اُبھرتا ہوا تخلیق کار اس بات سے مایوس کہ اُسے ایک پلیٹ فارم کے لئے ہنوز نہ جانے کتنی صدیوں تک انتظار کرنا پڑے گا۔ اور کب اُسے اُس کا مقام عطا کیا جائے گا۔



میں کبھی کبھار صرف اپنے لئے لکھتا ہوں کیونکہ انسان کبھی خود کو وہ سنانا چاہتا ہے جس کا اظہار وہ اوروں کے سامنے نہیں کرسکتا۔ کبھی کبھار میں خود اپنی تحریروں کے صنم توڑ دیتا ہوں۔ لفظوں کی بلند عمارتیں زمین بوس کر دیتا ہوں کیونکہ تلخیاں صفحہ قرطاس پہ جم جائیں تو زندگی کا ہر پل دردناک بن جاتا ہے۔ یہ قانونِ قدرت ہے نا کہ ہر دن جب شفق اپنی جلوہ سامانیوں کے ساتھ کرّہ ارض پہ نور بکھیرتا ہے تو امیدوں کو ایک نئی زندگی عطا ہوتی ہے اور میں انہیں امیدوں کے ساتھ جینا چاہتا ہوں ایک عام انسان کی طرح جو آخری سانس تک اُمید کا دامن نہیں چھوڑتا اور میرے لئے میری اُمیدیں میری تحریریں ہی ہیں۔

یہ میری کتاب آپ کس زمرے میں رکھنا پسند کرینگے مجھے خود بھی نہیں معلوم، میں بس یہ چاہتا تھا کہ میں اپنے جنون کو، جنوں کے عمل اور ردعمل کو ایک ساتھ آپ تک پہنچاؤں۔۔۔۔اسی لئے شاید میں نے اس کتاب میں کچھ تخلیقات، کچھ تبصرے اور کچھ رد عمل کے طور پر طبع کرنے کی کوشش کی ہے۔ نہ یہ روایت سے انحراف ہے اور نہ جدیدیت کی پرستاری۔ یہ ایک ہی لمحے میں خود اپنا ہی احتساب کروانے کی سعی ہے کیونکہ میں جانتا ہوں تخلیق تنقید کے لئے ہی پیدا ہوتی ہے لیکن جب سلسلہ یوں بھی دراز ہو کہ تنقید پہ بھی تنقید کرنے کا موقع ملے تو........

بہرحال میرا جو کچھ ہے آپ کے سامنے ہے، اس سے پہلے بھی بہت کچھ آپ کے سامنے رکھنے کی جسارت کر چکا ہوں۔ میرا عمل، ردعمل کا ہدف بنا ہے اور ردعمل نے مجھے کچھ اور لکھنے کی ترغیب دی ہے، اب آپ کا ردعمل کیا ہوگا یہ آنے والے لمحات کی مٹھی میں بند ہے۔ مٹھی میں میرے بھی بہت کچھ بند رہا ہوگا جیسے میری اب تک کی زندگی کے وہ

لمحات جو کثرت میں یوں تو رائیگاں گئے اور اگر کچھ لمحے ہاتھ آئے بھی تو اُنہوں نے خالی ہاتھوں میں کیا تھما کر اپنی راہ لی اس کا فیصلہ یہاں ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ وہ میزان بندے کے بجائے بندہ نواز کے پاس ہے جملہ حقوق کے ساتھ۔

شوقِ تحریر میری روح میں کب سرائت کر گیا اس کا احساس مجھے کبھی نہیں ہوسکتا کیونکہ میں احساس کی وادیوں میں رہ کر بھی بے حِس ہی رہا ہوں۔ حِس ہوتی تو دردیوں خاموشی سے برسوں تک میرا ہم نشیں نہ بنا ہوتا۔۔۔۔ کوشش کر رہا ہوں کہ خوابیدہ لمحات سے چونک کر زندگی کی اُن تلخیوں کو پھر سے چکھ لوں جن تلخیوں نے مجھے حادثاتی طور شاعر، افسانہ نگار یا کوئی اور ''بے کار سا فرد'' بنا دیا ہے۔

تیس سال سے بھی زائد عرصے میں مجھے قلم کی ''ہمسفری'' نے کن راہوں کا مسافر بنا دیا اب میرے پاؤں کے آبلے بھی مجھے اس کا پتہ نہیں دیتے۔۔ میں کسی مشین کا آہنی نہیں بلکہ ایک کاغذی پرزہ بن کر اس خیال خام میں مبتلا تھا کہ کبھی نہ کبھی کوئی نہ کوئی سنگ میل منزل کا پتہ دے گا لیکن مجھے کیا معلوم کہ میں جن راہوں پہ چل پڑا ہوں وہاں نہ سنگ میل ہوتے ہیں اور نہ منزل کی رہبری کرنے والے سنگ ریزے......سب اپنی اپنی راہ کے مسافر، دوگز زمین کے متلاشی، الگ الگ قبروں کی میتیں۔اور جب میرا وجود بھی کسی قبر کی میت بنے گا تب..........؟

فاتحہ رسم بن جائے گا۔خراج ایک ادا اور روح شاید اس بات پہ خندہ زن کہ شناخت کے لمبے سفر پہ آبلہ پائی کے بعد بھی کتبے پہ کوئی نام نہ اُبھر سکا ....یہ اُبھرنے اور مٹنے کا تصور یا پھر خدشۂ لاحق بھی زندگی کے ساتھ لگا رہتا ہے۔ وہ اور ہونگے جنہیں بنا مانگے سب کچھ مل گیا ہوگا...لیکن یہ دستِ سوال دراز کرنے کی عادت.....الاماں.......

''تحریریں''، آڑھی ترچھی، بدصورت یا خوشنما، پُر معنز یا بے معنی.....یقین مانیے
مجھے نہیں معلوم کہ آخران تحریروں کے حوالے سے میں اپنے دل کا کون سا تار چھیڑ رہا ہوں
ہاں اتنا احساس ہے کہ تحریر کے آگے ایک نِشتر ہے اور میں نہ جانے کیوں ''ابتدا'' سے لیکر
آج کے اس مجموعے تک اس نِشتر سے بہت آنکھ مچولی کرتا رہا ہوں شاید اس لئے کہ مجھے
متحرک رہنے کے لئے اس نِشتر کی کاٹ سے اور کوئی بہتر ترغیب دینے والی حِس نہیں مل
سکتی۔

میں اس کتاب کی تکمیل طباعت کے لئے اپنے اُن محبوّں اور رفیقوں کا مشکور و
ممنون ہوں جنہوں نے میری ادنیٰ سی تخلیقات پر اپنے گراں قدر تبصرے عنایت
فرمائے۔ برصغیر میں جس طرح سے اردو ادبی حلقے نے مجھے اپنی محبتوّں سے نوازا اُس
کے لئے مجھے اپنی تہی دامانی کا احساس ہو رہا ہے۔ کون کہتا ہے کہ اب اس دنیا میں محبتّ و
اخوت کے چراغ روشن نہیں ہیں۔ یہ اُن چراغوں کی ہی روشنی ہے جسے میں نے بڑے
پیار سے اپنے نہاں خانۂ دل میں ایک امانت کی طرح محفوظ رکھا ہے اور آج میں اُسی
اپنائیت کو آپ کے ساتھ بانٹنے کی جسارت کر رہا ہوں۔

کامیابی اللہ کے ہاتھ ہے لیکن آپ کے ہاتھوں میں دعا کی تاثیر ہے۔ مجھے
آپ کی دعاؤں کی ہی خیرات چاہیئے.....بس

خدا آپ کو اور ہمیں اپنی امان میں رکھے

زاہد مختار

تخلیق

افسانے

.... ہم تعلیمی دور میں سکولوں ، کالجوں اور
یونیورسٹیوں سے بہت سارا علم ہضم کر کے
نکلتے ہیں لیکن ......
ہمارے علم میں کتنا اضافہ ہو چکا ہوتا ہے
یہ سب حصول علم کے اگلے پڑاو پر ہی
پتہ چلتا ہے۔

گرم ہوا

(عصمت چغتائی کے نام کہ تواریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے!)

صمد میر فجر کی نماز سے فارغ ہوتے ہی اپنے ہاوس بوٹ ''چار چناری'' کی مغربی کھڑکی کھول کر جب ڈل کی خاموش سطح آب پر اپنی نظروں کا چپو چلاتے ہوئے دور ''چار چناری'' کے جزیرہ نما خطہ ارض کو دیکھتا تھا تو وہ اکثر اُداس ہو جاتا تھا۔ برسوں سے اب وہ اُس خطے کی اور اپنا شکارا لیکر نہیں گیا تھا۔۔۔۔۔ایک وحشت سی تھی جو اُس کے اندر یوں ڈیرا جمائے بیٹھی تھی جیسے ڈل کے سینے میں اُلجھی ہوئی کائی۔ حالانکہ برسوں سے وہ اُس چار چناری کے ساتھ اپنے آپ کو یوں منسلک کئے ہوئے تھا جیسے وہ اُس کا ایک خواب ہو اور شاید اسی لئے اُس نے اپنے ہاوس بوٹ کا نام بھی ''چار چناری'' ہی رکھا تھا ۔۔۔اُس کے ہم پیشہ لوگ تو یہاں تک بھی کہتے تھے کہ صمد میر کے گھر میں چونکہ چار خوبصورت بیٹیوں نے جنم لیا ہے اس لئے اُس نے اپنے ہاوس بوٹ کو چار چناری کا نام دیا ہے۔ لیکن یہ سب ماضی کی کہانی تھی۔ صمد میر کا حال اب اُس سے مختلف تھا۔

ماضی کا صمد میر ایک سجا سجیلا نوجوان تھا جس کے ہاوس بوٹ میں سیاحوں کی ایک بڑی بھیڑ ہوا کرتی تھی اور وہ اپنے مہمانوں کو روز ڈل کی حسین دنیا کی سیر کرانے کے

لئے اپنے خوبصورت شکارے کا چپو چلاتے ہوئے کوئی پیارا سا کشمیری گیت ضرور گنگناتا سیاح ڈل کے حسن سے لطف اندوز تو ہوتے ہی رہتے تھے لیکن ساتھ ہی صمد میر کی دلسوز آواز اُن پر کچھ اور جادو کر دیتی اور جب شام ڈھلتے ڈھلتے وہ اپنے شکارے کو چار چناری کے پاس روک کر اُن سے یوں مخاطب ہوتا کہ ''لیجئے یہ رہی ہماری خوبصورت سی چار چناری جسکے چار چناریوں لگ رہے ہیں جیسے ڈل کے آنچل پر کاڑھے گئے خوبصورت نقش و نگار'' تو سیاحوں کے دل میں ان چناروں کی عظمت کا احساس اور بھی گہرا ہو جاتا تھا۔۔۔۔

لیکن حال کا یہ عالم تھا کہ اب صمد میر کے لئے نہ اُس چار چناری کی کوئی خوبصورتی معنی رکھتی تھی اور نہ ہی اُس کی کوئی عظمت ۔۔ وہ آج اپنے ہی ''چار چناری ہاوس بوٹ'' کے ایک کونے میں مصلہ بچھائے اکثر اپنی نم ناک آنکھوں سے اپنے رب سے بس ایک ہی سوال پوچھا کرتا تھا کہ آخر وہ سب ہوا ہی کیوں۔۔۔

اور جو ہوا تھا وہ کسی نے سوچا بھی نہیں تھا۔۔۔ یہی تو انسان کی زندگی کی ایک ایسی گتھی ہے جسے آج تک کوئی سلجھا نہیں سکا ہے، یہاں اکثر وہ ہوتا ہے جس کا تصور بھی انسان نے نہیں کیا ہوتا ہے اور اکثر تصور میں بسایا ہوا محل یوں بھی زمین بوس ہو جاتا ہے کہ آسمان کی آنکھوں سے بھی دو آنسو چھلک پڑتے ہیں۔ صمد میر اب بس یوں ہی اشک بہایا کرتا تھا۔۔۔ اب اُن کے ہاوس بوٹ میں بھی وہ چہل پہل بھی نہیں رہی تھی اور شاید یہ سکوت بھی اُس کنبے کے لئے زیادہ ہی وحشت ناک ثابت ہو رہا تھا۔۔۔

انہی وحشتوں اور تنہائیوں کی گھٹن سے نجات پانے کے لئے جب آج علی الصبح

صمد میر نے اپنے ہاوس بوٹ کی کھڑکی کھول کر پھر اپنی مایوس نگاہوں سے اُس چار چناری کو دیکھا تو نہ جانے کہاں سے ایک خواہش اُڑتی ہوئی اُس کے ہاوس بوٹ کی کھڑکی پر آکر اُسے اپنی جانب متوجہ کرنے لگی۔۔وہ اُس خواہش کے سامنے تلملا اُٹھا۔بے قراری کے ہزاروں رنگ اُس کے چہرے پر یوں رقصاں ہوئے کہ اُسے ڈل کے پانیوں میں بھی اپنے اضطراب کا عکس نظر آنے لگا۔۔۔

''نہیں۔۔۔وہ خود سے بڑبڑاتا ہوا کھڑکی سے ہٹ گیا لیکن اُس کے قدم ایک انجانی کشش کے زیرِ اثر دھیرے دھیرے چار چناری ہاوس بوٹ کے ساتھ بندھے شکارے کی جانب بڑھنے لگے اور کچھ دیر کے بعد اُس کی بیوی اور بیٹیوں نے حیرت بھری نگاہوں سے اُسے خاموش چپو چلاتے ہوئے'' چار چناری'' کی جانب بڑھتے ہوئے دیکھا۔۔۔۔۔وہ خاموش تھا لیکن اُس کا چپو ڈل کے سینے میں ارتعاش پیدا کرتا ہوا جیسے چیخ چیخ کر اُسے کچھ یاد دلا رہا تھا۔۔ کوئی ایسی یاد جس کا عکس مٹانے کے لئے صمد میر نے اپنی بوڑھی آنکھوں سے پانیوں کی آبشار بہائی تھی لیکن یادوں کے عکس آنسوؤں سے دھوئے جاتے تو پھر دل کے نہاں خانوں میں درد کی ٹھیسیں نہ اُبھرتیں.........

صمد میر کے ہاتھ چپو چلانے میں محو تھے۔شکارا دھیرے دھیرے چار چناری کی اور بڑھ رہا تھا لیکن صمد میر کا ذہن ڈل کی گہرائیوں میں ڈبکی لگا کر پیچھے کی جانب تیر رہا تھا۔اچانک صمد میر کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی ''لاڈلی'' اور چپو چلانے والے اُس کے ہاتھ جیسے منجمد ہو کر رہ گئے۔۔۔وقت جیسے ٹھہر گیا اور ماضی کی دھند میں جیسے ایک خوبصورت سا چہرا مسکراتا ہوا صمد میر کی بانہوں میں سمٹ گیا..........

''مائی ڈیر ڈیڈی۔۔۔۔تمہیں ہم چاروں بیٹیوں میں کون سی بیٹی زیادہ اچھی

لگتی ہے۔ یہ آپ کو ابھی بتانا ہے۔ ابھی اور اسی وقت"

لاڈلی حسب معمول چہک رہی تھی اور اُس کی تینوں بہنیں جو عمر میں اُس سے بڑی تھیں اُس کی شرارتوں کی عادی ہوکر بھی اپنے باپ کے چہرے کی جانب ایسے دیکھ رہی تھیں جیسے کوئی طالبہ اپنا رزلٹ دیکھنے کے لئے گزٹ کے صفحات میں اپنے نمبر تلاش کر رہی ہو۔ لیکن وہ سب جانتے تھے کہ اُن کا باپ تانیہ کو ناراض کر ہی نہیں سا کیونکہ اُس کا دل توڑنے کی کوشش آج تک کسی نے کبھی کی ہی نہیں تھی۔ اسی لئے تو سب کی لاڈلی تھی اور سب اُسے پیار سے لاڈلی ہی کہا کرتے تھے۔

لاڈلی تھی بھی ایک چہکتی بُلبُل۔ اپنی بہنوں کے برعکس اُس نے دسویں تک تعلیم بھی حاصل کی تھی لیکن پھر صمد میر نے اُسے آگے پڑھنے سے روک دیا تھا کیونکہ ڈل کی وادیوں سے نکل کر کالج کی سرحدوں تک پہنچنا اُن دنوں کسی سنسان جنگل سے گذرنے کے برابر ہو گیا تھا۔ ہر طرف آگ و آہن کی بارش تھی، کرفیو، بم دھماکے، فایرنگ اور بھاگم بھاگ کا عالم تھا۔۔۔ حد یہ کہ اُس کا ایک ہم جماعتی لڑکا سریندر جسے وہ راکھی کے تہوار پر ہر سال راکھی باندھا کرتی تھی بھی ایک رات چپکے چپکے اُسے کچھ بتائے بنا اپنے والدین کے ساتھ وادی چھوڑ کے جموں کے کسی مائگرنٹ کیمپ میں جا بسا تھا۔۔ اُس دن جب لاڈلی کو اپنے باپ کی زبان سے سریندر کے یوں چوری چوری بھاگنے کی خبر ملی تو وہ دوڑتی ہوئی چار چناری ہاؤس بوٹ کی ایک کھڑکی کی آڑ میں روتی رہی تھی۔ اُس نے بہت دنوں تک سریندر کے دئے ہوئے اُس پن کو بھی ٹرنک سے باہر نکال کر دیکھنے کی جرات بھی نہ کی جو سریندر نے پچھلے سال راکھی کے تہوار پر اُسے تحفے میں دیا تھا۔ ان دنوں لاڈلی کچھ زیادہ ہی گم صم رہنے لگی تھی اسی لئے اُس کے والدین نے اُسے کچھ دنوں کے لئے

اپنے ماموں احد ملک کے پاس پہلگام بھیج دیا۔احد ملک پہلگام میں گھوڑے بان تھا، جو سیاحوں کے علاوہ ہر سال امرناتھ یاترا کے دوران یاتریوں کی خدمت کو اپنی زندگی کا اہم فریضہ سمجھنے لگا تھا۔ لاڈلی کا ماموں دیر رات گئے تک اُسے مختلف ریاستوں سے آئے ہوئے یاتریوں کے بارے میں بہت ساری دلچسپ باتیں بتایا کرتا تھا۔احد ملک نے اپنی پچاس سالہ زندگی کے دوران کچھ ایسے پہنچے ہوئے سادھوں سنتوں سے بھی ملاقات کی تھی جن کے اندر گیان کا ایک سمندر موجیں مارتا ہوا محسوس ہوتا تھا اور احد ملک نے اُن سے ایسی دلچسپ کہانیاں سنی تھی کہ اب لاڈلی بھی انہیں سنے بغیر بستر پر آنکھیں بند کرنے کی کوشش بھی نہ کرتی تھیں۔صوفی سنتوں کی ان بے مثال کہانیوں کی وجہ سے ہی لاڈلی کے ذہن سے دھیرے دھیرے خوف اور وحشت کا رنگ اُترنے لگا اور جب وہ واپس ''چار چناری ہاوس بوٹ'' پہنچی تو اُسکے والدین اور بہنوں نے اُس میں ایک خوشگوار تبدیلی پائی۔اس دوران ڈل کے پانیوں نے بھی وقت کے کئی مدوجزر دیکھے تھے۔اس کی سطح آب نے برفیلی ہواوں میں منجمد ہونے کا درد بھی سہا تھا اور گرمی کی تمازت کو بھی اپنے برہنہ بدن پر شدت کے ساتھ محسوس کیا تھا۔لاڈلی بھی دھیرے دھیرے زمان ومکان سے مانوس ہوتی ہوئی ''چار چناری ہاوس بوٹ'' میں آنے والے سیاحوں کو ڈل اور اسکے اردگرد کے بارے میں اپنی پروفیشنل انگریزی کے سہارے اپنی علمیت کا یوں بھرپور مظاہرہ کرنے لگی تھی کہ کچھ سیاح اُسے ایک ٹورسٹ گائیڈ کا نام دینے لگے تھے۔اور وہ تھی بھی ایک ایسی گائیڈ جسکی باتیں سن کر سیاحوں کے دل میں کشمیر کی خوبصورتی دیکھنے کا اشتیاق جلا پاتا تھا۔اُس کی اس صلاحیت کا احساس صمد میر کو بھی تھا اور شاید اسی لئے اُس نے اسے اپنے ہاوس بوٹ کا انچارج بھی بنالیا تھا۔ہر سیاح کو ٹور اور دیگر امورات کے بارے میں

لاڈلی ہی مشورہ دیا کرتی تھی۔ وہ دن بھران ہی مصروفیات میں اُلجھی رہتی لیکن شام ہوتے ہی جب سارے سیاح اپنے اپنے کمروں میں سو جاتے تو وہ اپنے بہنوں کے ساتھ ایک کمرے میں لیٹے لیٹے کھڑکی سے باہر دور دور تک پھیلے ہوئے آسمان کی وسعتوں میں اپنے ایک سوال کا جواب تلاش کرنے کی سعی کرتی کہ آخر سریندر کے ہاتھوں میں باندھی ہوئی اُس کی راکھی نے اُسے کشمیر چھوڑنے سے باز کیوں نہ رکھا۔ سریندر تو اُس سے اکثر کہا کرتا تھا کہ ''میری لاڈلی بہن۔۔ یہ راکھی کا کچا سا دھاگا اتنا مضبوط ہے کہ اسے دنیا کی کوئی طاقت توڑ ہی نہیں سکتی''

ہر رات یہ سوال اُسکے بھولے بھالے من کو کریدتا رہتا اور ہر رات وہ اس بات سے اپنے آپ کو تسلی دے کر نیند کی وادیوں میں کھو جاتی کہ سریندر ایک دن ضرور واپس آئے گا اور وہ ڈھیر ساری راکھیاں اُس کی ہتھیلی پر باندھ کر اُسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے وادی کی مٹی سے یوں باندھ دے گی جیسے ڈل کے سینے میں سمایا ہوا چار چناری کا خطہ ارض۔

لیکن اُس دن جب اچانک ایک بنجر زمین کے ایک ٹکڑے نے پورے گلستاں میں قحط کی سی صورتحال پیدا کر دی تو ڈل کی وادیوں میں سکون کے متلاشی سیاح بھی ایک ایک کر کے اپنا بوریا بستر ا باندھ کر گھروں کو روانہ ہوئے۔ چاروں طرف سناٹا سا چھانے لگا۔ سخت ترین کرفیو نے گھنٹہ گھر کے گھڑیال کی سوئیاں بھی جیسے منجمد کر دیں۔ پہرے داروں نے اخبارات کی سرخیوں کو قید کر دیا۔ اور پھر کچھ دنوں کے بعد جب بستیوں کے لوگ ڈل کی دنیا میں کھانے کی چیزیں تلاش کرنے کے لئے اُمڈ پڑے تو وہ صمد میر کے کنبے کو بھی شہر کی اقتصادی حالت کا کچھ کچھ اندازہ ہونے لگا حالانکہ ٹی وی پر روز کی خبروں

سے وہ ریاست کی صورتحال سے واقف ہو ہی رہے تھے لیکن اب کے جب شہر کے لوگوں نے حقیقت حال کی تصویر کشی کی تو صمد میر کو یوں لگا کہ اب کے جو رنگ اُفق پہ بکھیرا جا رہا ہے وہ ریاست کی جبیں پر ایک بدنما داغ کے مترادف ہوگا۔ اس دوران راکھی کا تہوار بھی آ کر گزر گیا اور لاڈلی کی لائی ہوئی راکھی دھری کی دھری رہ گئی۔ اُس رات لاڈلی ایک پل بھی نہ سو سکی۔

دوسرے دن پو پھٹتے ہی جب کرفیو میں دو گھنٹے کی ڈھیل دی گئی تھی۔ لاڈلی خود ہی شکارا کھیتی ہوئی نہرو پارک پوائنٹ کے پاس ایک لفافہ لیکر پہنچی اور جوں ہی اُس نے سریندر کے نام ایک درد بھرے خط میں لپٹی ہوئی راکھی پوسٹ کرنی چاہی عین اُنہیں لمحات میں ڈل گیٹ پوائنٹ سے ایک بھاری بھیڑ بھاگتی ہوئی آئی اور اس سے پہلے کہ لاڈلی کچھ سمجھ جاتی نہ جانے کہاں سے ایک اندھی گولی نے اُس کے ماتھے پر عین اُس جگہ سوراخ کر دیا جہاں اُس کے والدین نے ہزار بار محبتوں کے بوسے ثبت کئے تھے۔ وہ لڑکھڑا کر آخری بار زمین پہ گری اور......

صمد میر کا شکارا چار چناری خط ارض کے کنارے جا لگا جہاں اب تین چنار اپنے اُس چوتھے چنار کا ماتم کرتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے جو برسوں پہلے فوت ہو چکا تھا۔ ☆☆

(اکتوبر ۲۰۰۸ء)

دائرے

وہ بچپن میں اپنے آنگن میں جمی دھول پر شہادت کی اُنگلی سے ایک بڑا سا دائرہ کھینچ کر ہوا میں ایک اُچھال لیتے ہوئے اُس کے اندر کود جاتا تھا اور........خود کو بہت محفوظ سمجھنے لگتا تھا۔ نہ جانے اُس کے معصوم ذہن میں کب یہ بات سرائیت کرگئی تھی کہ وہ اس دائرے کے اندر سکول ماسٹر کی ڈانٹ سے اور ماں کی پھٹکار سے محفوظ رہ سکتا ہے اور اُس کا یہ گماں واقعی سچ بھی ہوتا تھا۔ وہ جب تک اپنے آنگن میں کھینچے گئے اُس حصار میں کھیلتا رہتا اُس کی ماں کو بھی شاید اس بات کا اطمینان رہتا تھا کہ اُس کا نٹ کھٹ بیٹا گھر کے آنگن میں ہی کھیل رہا ہے اور باہر کی ہواؤں سے محفوظ ہے۔

اور آج........

برسوں کے بعد جب وہ اپنی دس سال کی بچت اور اپنی نئی نویلی دُلہن کے طلائی زیورات کے بل پر اپنے نئے، چھوٹے اور خوبصورت سے مکان کے اندر پہلا قدم رکھنے لگا تو نہ جانے کیوں اُسے ایسا لگا کہ وہ ایک بار پھر بچپن کے اُسی دائرے میں داخل ہوگیا ہے جس میں وہ ہمیشہ اپنے آپ کو محفوظ سمجھنے لگتا تھا......لیکن...........

نئے گھر میں پہلے ہی لمحے سے نہ جانے کیوں اُس کی بیوی کو اس گھر میں ایک انجانی شئے کی موجودگی کا وہم ہونے لگا۔ اُسے یوں لگنے لگا کہ دو اجنبی آنکھیں اُس گھر

کے ہر کمرے میں اُسے تکتی رہتی ہیں۔ اُس نے کئی بار بیوی کے ذہن سے یہ وہم نکالنے کی کوشش بھی کی۔ ایک فقیر سے تعویز لاکر گھر کی چھت پہ بھی ٹانک دیا لیکن.......اُس کی بیوی نہ جانے کیوں گھر کی چار دیواری کے اندر بھی خود کو غیر محفوظ سمجھتی رہی۔ حد یہ کہ اُسکی بیوی کو اپنے کمرے میں کپڑے بدلتے ہوئے بھی ایک عجیب سی ہچکچاہٹ اور خوف محسوس ہونے لگا، اُسے یوں لگتا تھا کہ وہ آنکھیں بنا پلک جھپکائے اُسے سوتے ہوئے، رسوئی گھر میں کھانا پکاتے ہوئے یہاں تک کہ بستر پر لیٹتے ہوئے تک رہی ہیں۔۔اُس کی بیوی کے ذہن میں ان وحشتوں کے سائے اُس وقت اور گہرے ہو جاتے جب وہ خود ناشتے سے فارغ ہوتے ہی دفتر کے لئے روانہ ہو جاتا۔ کئی بار بیوی نے اُسے دفتر جانے سے بھی روکا تھا لیکن وہ مسکرا کر اُس کے گال پہ ہلکی سے چپت لگا کر اُس سے بس اتنا کہہ کے رخصت ہو جاتا تھا ''بھئی یہ ہمارا اپنا گھر ہے۔ اپنا گھر۔۔ بھلا کوئی اپنے گھر میں خود کو غیر محفوظ سمجھتا ہے''

لیکن.....

ایکدن اُس کی بیوی کا یہ وہم حقیقت کے لباس میں ایک بڑے ہی بھیانک انداز میں سامنے آیا....

اُس دن جب دونوں میاں بیوی ابھی صبح کی پہلی کرن کا چہرا بھی نہ دیکھ پائے تھے کہ دروازے پر ایک انجانی، بے وقت اور ــــــــ عجیب سی دستک نے اُن دونوں کو چونکا دیا۔ وہ کچھ سہما ہوا، کچھ اپنے حواس سمیٹتا ہوا جوں ہی دروازے کے پاس پہنچا تو اُسے ہوا میں ایک عجیب سی بدبو کا احساس ہونے لگا۔ دستک کی آواز بدستور اُس کے کانوں میں ارتعاش پیدا کر رہی تھی اور جب اُس نے اپنے تمام اعصاب مجتمع کر کے

دروازے کے پٹ واکردئے تو......

ہزاروں کی تعداد میں کالی بھیانک چیونٹیاں قطار در قطار اُسکے گھر میں داخل ہوگئیں اور آناً فاناً اُنکے ریڈنگ روم۔ ڈرائنگ روم، رسوئی گھر یہاں تک بیڈروم میں پھیل گئیں اور وہ دونوں میاں بیوی خوف کے مارے چیخ بھی نہ سکے۔ چیونٹیوں نے گھر کے ایک ایک کونے میں، ہر ایک شئے پر یہاں تک کہ دیوار پہ لگی کلاک اور پینٹنگ کے ساتھ وارڈ روب میں رکھے اُن کے کپڑوں اور رسوئی گھر کے ایک ایک برتن پر رینگنا شروع کردیا۔ چند ہی لمحوں میں ایسا لگنے لگا کہ اُن کے گھر کی ہر شئے بس چیونٹیوں کی لپیٹ میں ہے اور یوں جب اُن کے ذہنوں کو اس بات کا احساس ہوا کہ اب وہ چیونٹیاں اُن کے جسموں کو بھی اپنے لپیٹ میں لینے کا من بنا چکی ہیں تو اُس نے اپنی بیوی کا بازو تھام کر گرتے پڑتے آنگن کی طرف بھاگنا شروع کیا اور آنگن میں پہنچتے ہی جب اُنہوں نے پیچھے مُڑ کر اپنے گھر کی اور دیکھا تو اُنہیں گھر کی باہری چاردیواری پر بھی سینکڑوں چیونٹیاں رینگتی ہوئی دکھائی دیں...... اچانک بھاگتے بھاگتے اُس کے ذہن میں بچپن کا وہ کارنامہ اُبھرنے لگا اور یوں اُس نے گرتے سنبھلتے اپنے اور اپنی بیوی کے اردگرد شہادت کی اُنگلی سے زمیں پر ایک دائرہ کھینچتے ہوئے اپنے آپ کو ایک ''پناہ گاہ'' میں محفوظ کرلیا لیکن..... چند لمحوں کے بعد اُس نے اور اُس کی بیوی نے اپنے بھیانک انجام کی ابتدا خود اپنی دہشت زدہ آنکھوں سے دیکھ لی..... لکیر اپنی جگہ قائم تھی اور.......

دائرے کے اندر زمین کے بطن سے لاکھوں کالی بھیانک چیونٹیاں جنم لیکر اُن کی جانب قطار در قطار بڑھ رہی تھیں ☆☆

(جنوری ۲۰۰۹ء)

آخری آدمی

وہ اُس بستی کا آخری آدمی تھا جس بستی پر سانپوں نے حملہ کر کے ہر ذی روح کو ڈس لیا تھا۔......وہ اس لئے زندہ تھا کیونکہ اُسنے بین بجا کر سانپوں کو مدہوشی کے عالم کا اسیر بنانے میں مہارت حاصل تھی لیکن

اُس دن..........

جب وہ سورج کی پہلی کرن نمودار ہوتے ہی گھر کی دہلیز پہ اپنی بے تاج بادشاہی کا اعلان کرنے نکلا تو اُسے اپنے سامنے ایک خوفناک سیاہ چمکیلا سانپ پھن پھیلائے دکھائی دیا۔اُس نے گلے میں لٹکی بین کو ہاتھ لگانے کی کوشش کی ہی تھی کہ سانپ حیرت انگیز طور پر بول پڑا۔

''تم مجھے بین بجا کر اپنے بس میں نہیں کر سکتے آخری آدمی ...میں وہ سانپ ہوں جو بین کے سحر کا اسیر نہیں ہوتا''

''تو..تو تمہارا کیا مطلب ہے،تم مجھے بھی ڈس لینا چاہتے ہو، مجھے جس سے اس بستی کے ہر نکڑ پہ ڈیرا جمائے ہوئے سانپ بھی ڈرتے ہیں'' آخری آدمی نے اپنی تاجداری کا اعلان کرتے ہوئے کہا

''کیوں موت سے ڈر لگنے لگا ہے'' سانپ نے بھی جیسے اُسکی کمزور رگ پر

پھن مار دیا

''میں موت سے کھیلتا رہتا ہوں... تم مجھے کیا مارو گے۔ میں سانپ کو بس میں کرنے کا ہر منتر جانتا ہوں''

''کاش میں سانپ ہوتا تو تم شاید کامیاب ہوتے لیکن میں تو تمہاری طرح ایک آدمی ہوں... سانپ کے بھیس میں''

''کیا... !'' حیرتوں کا ایک اور پہاڑ اُس پر ٹوٹ پڑا

''ہاں... میں وہی ہوں جسے تم نے ان زہریلے سانپوں کے حوالے کیا تھا کیونکہ تم اس بستی کے واحد آدمی بننا چاہتے تھے... یاد ہے میں کتنا گڑگڑایا تھا تمہارے سامنے کہ مجھے ان سانپوں کے حوالے مت کرو۔ میں جینا چاہتا ہوں۔ بین بجا کر سانپوں کو مدہوش کر دو... میں مرنا نہیں چاہتا لیکن تم... تم پہ تاجداری کا بھوت سوار تھا اسی لئے تم نے مجھے اُن خوفناک سانپوں کے حوالے کر دیا۔''

''جھوٹ... تم وہ نہیں ہو سکتے کیونکہ اُسے ان سانپوں نے اتنی بار ڈس لیا ہوگا کہ اُسکا سارا جسم نیلے زہر کی رنگت لئے پھول چکا ہوگا''

''اور تم وہ ڈنک، میری وہ تڑپ۔ میری وہ بے کسی دیکھ کر ذرا بھر بھی شرمندہ نہیں ہوتے۔ تمہیں اپنے جیسے ہی ایک انسان کو تڑپ تڑپ کر مرتے ہوئے دیکھ کر ذرا بھر بھی افسوس نہیں ہوتا''

'بالکل نہیں... کیونکہ ایک انسان کو مار کر ہی دوسرا انسان اپنی سرداری کا اعلان کرتا ہے''

'لیکن میں زندہ ہوں، تم مجھے نہیں مروا سکے''

جھوٹ..... ان سانپوں کا ڈسا پانی بھی نہیں مانگتا اور تمہارا یہ دعویٰ کہ تم ہزاروں ڈنک سہنے کے بعد بھی زندہ ہ!''

''ہاں میں زندہ ہوں ۔تبھی تمہارے سامنے کھڑا ہوں لیکن میں اب تمہاری طرح ایک انسان نہیں بلکہ اُن سانپوں کی مانند ایک سانپ بن گیا ہوں''

''ناممکن..... یہ کوئی دیو مالائی کہانی نہیں جسے سنا کر تم مجھے مرعوب کرنے کی کوشش کرر ہے ہو''

''میں تمہیں مرعوب کرنے نہیں بلکہ تمہیں ڈسنے آیا ہوں اور میرا ڈسا ہوا مٹی بھی نہیں چاٹ سکتا''

''لگتا ہے تم ایسے نہیں مانو گے'' یہ کہتے ہوئے آخری آدمی نے بین کو منہ سے لگاتے ہوئے اُس کے سروں کو بکھیرنے کا عمل شروع کردیا لیکن وہ سیاہ پھنکارتا ہوا خوفناک سانپ اُسے بدستور گھورتا ہوا چلایا

''بند کرو یہ بے سرا ناٹک...میں ان سروں کے مایا جال کا اسیر نہیں ہوسکتا...تم بھول چکے ہو کہ میں اس بستی کا سردار تھا جسے سانپوں کے حوالے کر کے تم یہاں کے بے تاج بادشاہ بننا چاہتے تھے لیکن تم ایک بات بھول گئے تھے کہ مجھے تمہاری اس بین سے بھی زیادہ موثر اور طاقتور علم حاصل ہے''

''موثر اور طاقتور علم''

''ہاں وہ علم جو مجھے تمہارے اور ان سانپوں کے قہر سے نہ صرف بچا سکا ہے بلکہ

''بلکہ کیا....؟''

''بلکہ میں اب ان سانپوں کا بھی سردار بن چکا ہوں''

"نہیں......آخری آدمی کی حیرت بھری چیخ اُسکے ہونٹوں میں ہی دب کے رہ گئی کیونکہ سیاہ چمکیلا حیرت انگیز سانپ اُسے ڈنک مار چکا تھا۔ آخری آدمی کو اپنے ہونٹوں کے کناروں سے سفید سفید جاگ اُبلتا ہوا محسوس ہونے لگا اور اُسکی آنکھوں میں ایک اندھیرا سا چھانے لگا لیکن ایک انجان سی بے ہوشی یا پھر موت کی تاریکی میں ڈوبنے سے پہلے اُسے سیاہ چمکیلے سانپ کی آخری بات دور کسی گنبد میں گونجتی ہوئی سنائی دی

"تم مجھے نہیں جانتے آخری آدمی ...تم تاجداری کا خواب دیکھتے ہوئے بھول گئے تھے کہ راج کرنے کا علم صرف میں جانتا ہوں ...صرف میں........." چمکیلا سانپ بنا بین کے ناچ رہا تھا اور..................

آخری آدمی آخری ہچکی لے چکا تھا☆☆

(اگست ۲۰۰۷ء)

کچرا

صمد شیخ گلی کی نکڑ تک سارا کچرا ڈھوتے ڈھوتے یہی سوچ رہا تھا کہ باہر سے عالیشان دکھائی جانے والے ان گھروں کے اندر کتنی گندگی ہوتی ہے۔۔۔۔۔ وہ سارا کچرا ایک جگہ جمع کر کے اُسے اُس کچرے کے ڈبے میں جمع کرتا تھا جو گلی کی نکڑ پر شاہراہ کے کنارے میونسپلٹی والوں نے نصب کیا تھا لیکن ہر روز اُس کچرے کے ڈبے کے پاس پہنچ کر صمد شیخ کو بار بار اپنے اندر ایک آواز گونجتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔۔۔۔وہ آواز جو اُس کے جسم جگر کو چھلنی کر دیتی تھی۔

''تم کیا ہو اور تمہاری اوقات کیا ہے...تم ایک کچرے کا ڈبہ ہو..کچرے کا ڈبہ....'' دلاور خان کی وہ آواز اکثر اُسکے کانوں میں گونجتی تھی اور آج بھی اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے اُس کے سارے وجود کو پہلے پرزے پرزے بکھیر دیا ہو اور پھر جھاڑو سے ڈھو کر اُس کچرے کے ڈبے میں ڈال دیا ہو۔۔۔۔۔۔ کچرا.... وہ خود سے خود ہی مخاطب ہوا کرتا تھا....

کیا خطا تھی اُسکی کہ اُسے اُس گھر سے دھکے مار مار کے باہر نکال دیا گیا تھا۔ یہی نا کہ اُس نے بڑی جرأت کر کے تین مہینے کی تنخواہ کا تقاضا کیا تھا اور بدلے میں وہ

سیاسی بادشاہ اپنا فیصلہ صادر کر چکا تھا'' کچرے کے ڈبے.........تمہاری یہ جرات کہ تم مجھ سے تقاضا کرو.... مجھ سے .... جو تم جیسے ہزاروں آدمی اپنے جوتی کی نوک پہ رکھتا ہے....تم نے اپنے منہ میں یہ الفاظ لانے سے پہلے اپنی زبان کو دانتوں سے کیوں نہیں چبایا..جاو دفع ہو جاو اس گھر سے''

اور یوں صمد شیخ کو اُس گھر کے کچرے کی طرح باہر پھینک دیا گیا تھا.......

صمد شیخ کے پورے وجود میں تب بھی آگ لگی تھی اور آج بھی اُس کا روم روم جھلس رہا تھا لیکن قریب ہی ایک چھوٹے سے چوک کے آر پار دلاور خان کی ایک قد آدم تصویر کے ساتھ اُس کی شان میں قصیدے بیان کرتا ہوا ایک رنگین بینر(Banner) صمد شیخ کی جلتی پر تیل چھڑکتا ہو جیسے اُس کا مذاق اُڑا رہا تھا'' صمد شیخ.......دیکھ...آنکھیں کھول کے دیکھ...ایک زمانے کا مشہور جنگل سمگلر دلاور خان آج آسمان میں اُڑ رہا ہے۔ وہ اب اس شہر کا ایک بارسوخ شخص ہی نہیں ایک مشہور سیاستدان بھی ہے اور تم آج بھی اس کچرے کے ڈبے کی طرح..........!'' صمد شیخ نے ایک جھٹکے سے کچرے کے ڈبے کا ڈھکن بند کر دیا جیسے اپنے ذہن میں گونجتی آوازوں کا گلا دبا رہا ہو اور تلملاتے ہوئے گھر کی راہ لی۔

گھر کے آنگن میں داخل ہوتے ہی اُس نے اپنی چھ سال کی ننھی منی بیٹی مینا کو ایک گڈیا کے ساتھ کھیلتے ہوئے دیکھا۔ پہلے تو اُس کا ماتھا ٹھنکا کہ کہیں مینا نے یہ گڑیا کسی سے چھین تو نہیں لی ہے لیکن پھر جب اُس نے گڑیا کی حالت دیکھی تو اُسے یہ احساس ہو گیا کہ مینا کے ہاتھ میں تھمی ہوئی گڑیا کسی نے ردی سمجھ کے باہر پھینک دی ہوگی۔ایسی کئی چیزیں وہ اپنے علاقے کی گلیاں صاف کرتے ہوئے جھاڑو کی زد میں آتے ہوئے دیکھ

چکا تھا۔ اپنی بیٹی کو پہلی بار یوں خوش دیکھ کر صمد شیخ کے اندر اُبلتا ہوا لاوا بھی کچھ ٹھنڈا پڑ گیا.....

مینا سچ مچ یہ گڑیا پا کر بہت خوش تھی۔ اُسے یہ گڑیا اپنی ہی گلی کے نکڑ پہ ملی تھی اور شاید پہلی بار اُس کے بچپن کو کھلونے کا ایک حسین اور معصوم خواب مل گیا تھا........ حالانکہ یہ گڑیا بھی تو ایک تار تار خواب کی مانند تھی۔ ایک ایسی گڑیا جسکے تن پر چتھیڑے بھی باقی نہیں بچے تھے۔ جسکے بال نوچ گئے تھے۔ جسکی پلاسٹک ٹانگیں اور بازو دانتوں سے چبا چبا کر زخمی کر دئے گئے تھے۔ جسکے خوبصورت سے چہرے اور بڑی بڑی آنکھوں کو بال پن سے بدنما بنا دیا گیا تھا۔ وہ ایک بدہیت گڑیا تھی لیکن مینا کے لئے وہ فقط ایک گڑیا تھی، ایک ایسی گڑیا جس کا اُسنے صرف تصور کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس گڑیا کو گلی سے اُٹھا کر جب گھر لائی تھی تو سب سے پہلے اُسنے اُسے نلکے پہ لے جا کر کپڑے دھونے کے صابون سے خوب رگڑ رگڑ کر دھویا تھا۔ پھر اُسنے اُسکے ارگرد ایک رنگین کاغذ لپیٹا تھا جو ایک دن نہ جانے کہاں سے ہوا میں تیرتا ہوا اُن کے چھوٹے سے آنگن میں گرا تھا اور ننھی مینا نے اُسے سنبھال کے رکھا تھا۔ شاید وہ ایک ایسی پتنگ کا پرزہ تھا جسے کسی چیل نے نوچ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہو۔ مینا نے گڑیا کے بازوؤں اور ٹانگوں کی حتی المقدور ''مرہم پٹی'' بھی کی اور یوں اُسے خوبصورت نہ سہی لیکن قبول صورت بنا ہی دیا۔

مینا گھر میں ہر روز تقریباً اکیلی ہی رہتی تھی کیونکہ صمد شیخ سویرے گلی کوچوں کی صفائی کرنے کے بعد گھر آ کے تلخ چائے کے کچھ گھونٹ پی کر میونسپلٹی کے دفتر چلا جاتا تھا اور مینا کی ماں زیبا کچھ گھروں میں جھاڑو مارنے اور فرش وغیرہ دھونے کا کام کرتی تھی۔ یوں مینا کی تنہا زندگی میں اس گڑیا نے جیسے رنگ بھر دیا تھا۔ وہ اُس دن صبح سے دوپہر تک

اُس گڑیا کے ساتھ یوں منہمک رہی کہ اُسے پتہ بھی نہ چلا کہ اُس کی ماں کب لوٹ کر چولہے کی اُلجھنوں میں یوں قید ہوگئی تھی کہ اُسنے گڑیا اور مینا کی جانب بھی کوئی توجہ نہیں دی۔ مینا بھی اپنی ماں کے تھکن بھرے چہرے سے بے نیاز اپنی اُس نئی دنیا میں گم تھی جہاں وہ تھی اور اُس کی گڈیا..آج اُسے کھانے پینے کا بھی ہوش نہیں رہا تھا ورنہ وہ ہر روز ماں کے آتے ہی اُس کے دامن سے لپٹ کر کسی نہ کسی کھانے کی چیز کا تقاضا کرتی رہتی تھی لیکن آج........وہ کبھی گڑیا کو اپنی ننھی سی گود میں لٹاتی، کبھی اُسے اُس کی زخمی ٹانگوں پر استادہ کرنے کی کوشش کرتی اور کبھی اُس کی اُلجھی زلفوں کو سنوارنے کا جتن کرتی۔.....

باہر دھوپ کی تمازت بڑھنے لگی تھی......مینا کو ایسا لگا جیسے اُسکی گڑیا کو دھوپ نے تپش نے ادھ موا کر دیا ہو۔ وہ اُسے اپنے ننھے سے سینے کے ساتھ چمٹا کر جوں ہی گھر کے اندر لے گئی عین اسی لمحے اُس کا باپ صمد شیخ بھی غیر متوقع طور آج دوپہر کو ہی گھر لوٹ آیا۔ صمد شیخ نے عجلت میں گھر کے اندر داخل ہوتے ہی گھر کا دروازہ بند کرتے ہوئے سامنے ہی کسی کام میں مصروف زیبا کو دبے لہجے میں یہ کہانی سنائی کہ لوگوں کے ایک مشتعل ہجوم کو قابو میں کرنے کے لئے شہر کے ایک چوک میں آنسو گیس کے گولے پھینکے گئے ہیں اور اب باہر کرفیو لگ چکا ہے۔

''کرفیو......'' زیبا کے چہرے پہ حیرت تھی لیکن مینا کچھ لمحے باپ کے چہرے کو تکنے کے بعد پھر گڑیا کو سنوارنے لگ گئی تھی

''یہ تو ہونا ہی تھا.....'' زیبا جھجھلا کر اندر جانے لگی اور صمد شیخ نے بند دروازے پر کنڈی چڑھادی۔

اُس دن کے بعد تقریباً ایک ہفتے تک باہر کیا ہوا۔ اس بات کا کچھ کچھ احساس

زیبا اور صمد شیخ کو کبھی کبھی دریچے سے باہر جھانکتے ہوئے ہو ہی جاتا تھا لیکن مینا کو ان دنوں صرف ایک ہی فکر کھائے جارہی تھی کہ اُس نے گڑیا کے تن پر جو رنگین کاغذ لپیٹا تھا وہ اب کہیں کہیں سے پھٹ چکا تھا۔ اسی لئے اب وہ اپنے والدین سے اس بات کا تقاضا کرنے لگی تھی کہ وہ اُسے گڑیا کے لئے ایک خوبصورت سا فراک لاکر دے۔ زیبا مینا کی اس بات پہ تلملا اُٹھتی تھی لیکن صمد شیخ اپنی بیٹی کو یہ کہہ کر مطمین کرنے کی کوشش کرتا کہ کرفیو ختم ہونے کے بعد جوں ہی بازار کھلے گا تو وہ اپنی بیٹی کی گڑیا کے لئے ایک خوبصورت فراک ضرور لائے گا اور یوں مینا اب کرفیو کا مفہوم نہ جانتے ہوئے بھی اس بلا کے خاتمے کی منتظر تھی۔

بلآخر سات دن کے بعد کرفیو میں دو گھنٹے کی ڈھیل دی ہی گئی۔ اور یوں صمد شیخ اُس دن علی الصبح جب گلی کی صفائی اور گھر کی ضرورت کا سامان لانے کے لئے اپنی دہلیز پار کرنے لگا تو ننھی مینا نے باپ کے فرن کا دامن پکڑتے ہوئے اُس سے گڑیا کے لئے فراک لانے کی معصوم التجا پھر دہرائی اور ...آج پہلی بار صمد شیخ کو یوں لگا کہ وہ جھوٹ بولنے کی چاہ کرنے کے باوجود بھی جھوٹ بول نہیں سکتا۔

میونسپلٹی نے شہر کے اطراف واکناف میں غلاظت اور کچرے کے جمع ہوئے ڈھیر کو صاف کرنے کا ہنگامی اعلان کر دیا تھا اور یوں آج صمد شیخ کو اپنے علاقے کے چاروں طرف بکھرے کچرے کو صاف کرنے کے لئے جہاں صرف دو گھنٹے کا وقت ملا تھا وہیں اُسے اس بات کا بھی غم ستائے جارہا تھا کہ اگر وہ اپنا روزمرہ کا کام وقت پہ ختم نہ کر سکا تو وہ کرفیو کی ڈھیل ختم ہونے سے پہلے نہ گھر کے لئے کوئی سامان لاسکتا ہے اور نہ ہی مینا کی گڑیا کے لئے کسی درزی کی دکان سے کپڑے کا ایک چھوٹا سے ٹکڑا... کیونکہ گھر سے

نکلتے ہی بنا کوئی جھوٹ بولے اُسنے یہی تہیہ کیا تھا کہ وہ اپنے محلے کے اسمال درزی کی دکان سے کپڑے کا ایک رنگین ٹکڑا مانگ کر زیبا سے کہے گا کہ وہ مینا کی ایک گڑیا کے لئے ایسا ویسا ہی سہی کوئی فراک ہاتھ سے سی لے.. لیکن آج اسمال درزی کی دکان بھی بند تھی اور علاقے کا ڈھیر سارا کچرا ابھی جیسے اُس کا مذاق اُڑا رہا تھا۔

کچھ دیر کے بعد جب صمد شیخ مشینی انداز میں گلی کا کچرا ڈبے کے قریب پہنچانے میں کامیاب ہوا تو اُسنے کچرے کے ڈبے کا ڈھکن ہی غائب پایا..... صمد شیخ کو اس ''واردات'' سے اُتنی حیرت نہ ہوئی جتنی اس بات سے کہ آج کچرے کے ڈبے کے پاس پہنچ کر اُسے اپنے اندر دلاور خان کی زہر میں ڈوبی ہوئی آواز گونجتی ہوئی سنائی نہ دی ایک لمحے کے لئے صمد شیخ مبہوت ہو کر رہ گیا لیکن جب اُس کی نظر کچرے کے ڈبے میں پڑے رنگین بینر کے چند ٹکڑوں پر پڑی تو اُسے یوں لگا جیسے نوجوانوں کا ایک مشتعل ہجوم نعرے لگاتا اپنے پیروں تلے سڑکوں اور گلیوں کے سارے ''نقش کہن'' مٹاتا ہوا گزر رہا ہو۔ اسی لمحے صمد شیخ نے اپنے علاقے کے اُس چھوٹے سے چوک کی اور دیکھا جہاں آج دلاور خان کے بینر کے بچے ہوئے پرزے ہوا میں یوں لٹک رہے تھے جیسے کسی کے غرور کا ماتم منا رہے ہوں۔.... کچھ دیر بعد.......

صمد شیخ پرسکون انداز میں اپنے گھر کی دہلیز پار کر رہا تھا۔ کچھ گھریلو سامان اور کچرے کے ڈبے سے اُٹھائے ہوئے رنگین بینر (Banner) کے چند ٹکڑے لیکر جن سے مینا کی گڑیا کا ایک فراک تو بن ہی سکتا تھا۔☆☆

(نومبر ۲۰۰۸ء)

جبلت

کشمیر میں سردیاں اپنی پہلی دستک دے چکی تھیں۔ ایک جانب چنار کے پتے اپنی آتشیں چادر پھیلائے سرزمیں کو حرارت بخشنے کا ساماں کر رہے تھے تو دوسری جانب دیہاتی لوگوں نے اِن پتّوں کو جلا کر سردیوں سے نبرد آزما ہونے کا اہتمام کرنا شروع کر دیا تھا۔ اب جہاں تک شہروں اور قصبوں میں رہنے والے لوگوں کا تعلق ہے تو ہمارے لئے کوئلہ جنگلوں اور گاؤں سے بوریوں میں بھر کے کچھ دیہاتی یا گوجر لوگ لے آتے تھے۔ ہمارے گھر میں بھی پچھلے کئی سالوں سے پہلگام کے ایک پہاڑی علاقے میں رہنے والا درمیانی عمر کا سلیمان خان ہر سال دو چار کوئلے کی بوریاں لاکر سردیوں کے ابتدائی اور شدید دور 'چلہ کلان' میں دستک دینے آتا تھا اور اس برس بھی جنوری کی ایک ٹھٹھرتی صبح جب میں اور میری بیوی اپنے تنہا تنہا سے گھر میں نمکین چائے سے لطف اندوز ہونے کا جتن کر رہے تھے تو دروازے پر ایک مانوس سی دستک نے ہمیں سلیمان خان کی یاد دلا دی۔ سردیوں کی طرح سلیمان بھی اپنی آمد کی روایت قایم رکھ چکا تھا۔ میں نے اپنے اردگرد شال اوڑھ کر جب باہری دروازہ کھولا تو مجھے پہلے سلیمان خان نظر آیا۔ کاندھے پر دو کوئلے کی بوریاں اُٹھائے ہوئے۔ آج اُسکی داڑھی سے جھانکتے ہوئے کچھ سفید بال مجھے اس بات کا احساس دلا رہے تھے کہ سلیمان کے گوجر کوٹھے میں

گوشہ نشینی اپنا بسیرا تلاش کرنے لگی ہے۔ سلیمان کے ساتھ دس بارہ سال کا ایک گوجر لڑکا بھی موجود تھا اور ہمارے گھر کے باہر ہمیشہ آلتی پالتی مارے بیٹھا ہوا وہ کتا اُن پر زور زور سے بھونک رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اگر چہ کتے نے بھونکنا بند کر دیا لیکن وہ اب بھی سلیمان اور اسکے ساتھ آئے لڑکے کو خونخوار نظروں سے گھور رہا تھا۔

''صاحب جی سلام علیکم، کوئلہ لایا ہوں، وہی اپنے والا، دیودار والا اصل کوئلہ'' سلیماؔن کا لہجہ سردی کی شدت سے کانپ رہا تھا۔ اگر چہ ابھی برف کی چادر نے وادی کو اپنی لپیٹ میں نہیں لیا تھا لیکن خشک و سرد ہوائیں ہر ذی حس کو آنے والے دنوں سے آگاہ کر رہی تھیں

''آو سلیماؔن آو، اندر آجاو۔۔۔'' میں نے دروازہ کھول کر اُسے اندر آنے کا راستہ دیتے ہوئے کہا '' ہم ابھی ابھی تمہیں ہی یاد کر رہے تھے۔ بڑی لمبی عمر پائی ہے تم نے''

''صاحب جی۔ لمبی عمر کس نے دیکھی ہے۔ ہم پہاڑی لوگ تو پل پل مرتے ہی رہتے ہیں مگر صاحب جی میں آپ کے لئے کوئلہ لانا نہیں بھولتا چلہ کلان کے ساتھ ساتھ میں بھی کوئلہ لیکر آہی جاتا ہوں کیوں صاحب جی۔۔ میں اور چلہ کلان ۔۔ ہا ہاہ'' سلیماؔن اپنے زردی مائل نسوار سے آلودہ دانتوں کی نمایش کرتا ہوا اندر داخل تو ہو گیا تھا لیکن میں اُسکے صاف و شفاف خلوص کی خوشبو ہی محسوس کرتا رہ گیا۔ اُس نے صحن میں داخل ہوتے ہی پہلے بوریوں سمیت دیوار کے ساتھ ٹیک لگا دی اور پھر اپنے کاندھے سے بندھی رسی کھول کر پہلے خود کو آزاد کر دیا اور پھر بوریوں کو زمین پر دھیرے دھیرے پیٹھ کے سہارے ڈال دیا۔ اس دوران اُس کے ساتھ آئے اُس معصوم چہرے والے

لڑکے نے جس انداز سے اُسکی مدد کی اُس سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا تھا کہ لڑکا پھرتیلا بھی ہے اور سمجھدار بھی۔۔۔۔ کچھ لمحوں کے بعد وہ دونوں کپڑے جھاڑ کر۔ صحن میں لگے نل پر ہاتھ منہ دھوکر ہمارے کمرے میں ہمارے ساتھ نمکین چائے پی رہے تھے۔اسی دوران سلیمان نے اُس لڑکے کی دردناک کہانی سنادی۔

''یہ میرے بھائی دلدار خان کا لڑکا ہے صاحب۔۔نورا۔۔ میرا بھائی کچھ ماہ قبل ایک پہاڑی سے پھسل کر اللہ کو پیارا ہوگیا صاحب۔اب اس نورے کی ماں کا نہ کوئی سہارا ہے اور نہ کوئی ذریعہ معاش۔۔ اللہ آپکو ترقی دے صاحب اسے یہیں کہیں کسی مکان یا دکان میں نوکر رکھوالیتے تو مجھ پہ بڑا احسان ہوتا''

سلیمان کی باتوں کے دوران میں نے کئی بار اپنی بیوی کی جانب دیکھا اور اُسکی کہانی ختم ہوتے ہی مجھے اس بات کا اشارہ بھی مل چکا تھا کہ نورے کو اپنے ہی گھر میں رکھا جائے۔۔۔ کچھ دیر بعد سلیمان نورے کو ہمارے گھر میں پانچسو روپے ماہوار اور کپڑے لتھے کی ذمہ داری سونپ کر خوش خرم واپس پہلگام کی یخ بستہ ہواؤں کی جانب لوٹ چکا تھا۔ میں نے بیوی کے کہنے پر نورے کی ماں کے لئے اُسے دو تین سو روپے ایڈوانس بھی دئے تھے تاکہ اُس کے گھر کا چولا بھی جلتا رہے۔

اس کے بعد ایک مہینے تک سلیمان نے دوبارہ ہمارے گھر کے دروازے پر دستک نہ دی لیکن ایک بار جب وہ دودھ سے بنی ہوئی کچھ پنیر نما روٹیاں ''مانشہ کرارہ'' لیکر ہمارے گھر آیا تو وہ نورا کے چہرے اور رکھ رکھاو میں آئی تبدیلی سے خوش ہوکر اُسکی ماں کے لئے کچھ اور روزی روٹی کا سامان اور روپے لیکر خوشی خوشی گھر لوٹا۔اس دوران نورا نہ صرف ہمارے گھر کا ایک فرد بن چکا تھا بلکہ وہ کتا بھی اب اُس سے کافی حد تک مانوس

ہو چکا تھا جس نے پہلے دن اُس کا استقبال اپنی خونخوار نظروں اور چیختی آوازوں سے کیا تھا۔ دراصل یہ کتا کچھ عرصے سے ہمارے ہی گھر کے باہر ہمارے گھر کی روٹی اور دستر خوان سے بچے ہوئے چاولوں یا ہڈیوں پر پل رہا تھا۔ اسے جب ہمارے محلے کے ایک اجاڑ پنڈت مکان میں اپنی ماں نے جنم دے کر چلنا پھرنا سکھانے کی کوشش کی تھی تو ایک چمچماتی گاڑی والے نے ایک دن اُسے لنگڑا بنا دیا تھا۔ اُن دنوں میں نے بڑے جتن کر کے نہ صرف اُسکی ٹانگ کا مقامی ویٹرنری ہسپتال میں علاج کروایا تھا بلکہ تب بھی اُسے اُن میونسپلٹی ورکروں کی ستم ظریفی سے نجات دلائی تھی جب وہ محلے کے آوارہ کتوں کو زہر دینے کی مہم چلا رہے تھے۔ اب وہی پلاّ، ایک جسیم کتے کی صورت میں نہ صرف ہمارے گھر کے باہری دروازے کے باہر موجود رہتا تھا بلکہ محلے کے سارے مکینوں کو رات کے سناٹے میں اُسکے بھونکنے سے یہ پتہ چلتا تھا کہ کب کوئی اجنبی یا گشت پہ نکلے ہوئے پولیس والے ہمارے محلے کی گلی سے گذر رہے ہیں۔ بچوں نے اس کتے کا ایک نام بھی رکھا تھا ''شیرو'' اور وہ اپنے اس نام سے مانوس بھی تھا کیونکہ جب بھی رات کا کھانا کھانے کے بعد میری بیوی اندھیرے میں اُسکے حصے کا کھانا لیکر باہری دروازہ کھولتی تھی تو وہ اُسے شیرو کہہ کر ہی مخاطب کرتی تھی اور وہ جہاں بھی کہیں ہوتا، دوڑتا ہوا ہمارے دروازے تک پہنچ جاتا۔۔۔۔اب اُسی شیرو کے سامنے نورآ کھانا ڈال دیتا تھا۔ وہ بھی اکثر اُسے اسی نام سے پکار کر اپنی جانب متوجہ کر لیتا تھا۔ کبھی کبھار تو وہ اُس کے ساتھ گلی کے اُس آخری موڑ تک صبح سویرے نانوائی کی دکان تک ساتھ چلتا جب نورآ سویرے چائے کے لئے کشمیری نان (لواسہ) لانے کے لئے نکلتا۔

میں اور میری بیوی اکثر دل ہی دل میں اللہ سے یہ شکوہ کیا کرتے تھے کہ پانچ

سال کی شادی شدہ زندگی گذارنے کے باوجود ہمارے گھر میں اُسکی رحمت نے کوئی چراغ کیوں نہیں جلایا ہے لیکن نہ جانے کیوں اب ہمیں نورا کے آنے کے بعد یہ احساس اور زیادہ شدت سے ستانے لگا تھا۔ خاص کر جب کبھی نورا اچانک سیڑھیوں سے اُترتے ہوئے یا چڑھتے ہوئے سامنے آتا تو اکثر دل میں ایک ہوک سی اُٹھتی کہ کاش اسی طرح ہمارا اپنا لختِ جگر بھی ہمارے روبرو آجاتا۔ یوں ہی اچانک، معصوم سے انداز میں..... لیکن میں اکثر اپنے دل میں اُٹھتی اس ہوک کو چھپائے رکھتا یہ جانتے ہوئے بھی کہ میری بیوی بھی کچھ ایسے ہی جاں لیوا لمحے سے گذر رہی ہے۔

نورا ہر طرح سے گھر کا ایک اچھا خدمتگار ثابت ہو رہا تھا۔ ابتداء میں وہ ہر رات سونے سے پہلے مجھ سے اکثر کہا کرتا تھا ''صاحب جی پیر دباؤں، دن بھر کی تھکان دور ہو جاتی ہے، میں اپنے بابا (دلدار خان) کے بھی پیر دبایا کرتا تھا''

''نہیں نورا، یہ عادت بعد میں ایک نشہ بن جاتی ہے۔۔ اور پھر جب تم ایک دن اپنے گھر جاؤ گے تب بھلا میری یہ خدمت کون کرے گا'' میرا یہ جواب سن کر نورا اکثر مایوس ہو جاتا تھا اور میرے اندر کی ہوک بھی مجھے کہیں اندر ہی اندر کچھ اور کریدتی جبکہ میری بیوی کا منہ اُسکے اپنے آنچل میں چھپ جاتا۔ اسی لئے شاید نورا اب ''اس خدمت'' کا ذکر بہت کم کیا کرتا تھا۔ اسکے باوجود نورا ہماری زندگی کی ہر تگ ودو کا ایک حصہ بن چکا تھا۔ ہم کہیں دعوت پہ جاتے یا کہیں سیر سپاٹے پہ نورا ہمیشہ ہمارے ساتھ ہوتا تھا ہماری اپنی اولاد کی طرح۔ نورا کے آنے سے پہلے جب بھی ہم اپنے گھر کے باہری دروازے پہ ایک موٹا سا تالا لگا دیتے تھے تو ''شیرو'' اکثر ہمارے پیروں سے لپٹ کر جیسے ہم سے یہ سوال کرتا ہوا محسوس ہوتا تھا ''آپ کب واپس آرہے ہیں۔'' ساتھ

میں ہی ہمیں یہ اطمینان بھی دلاتا رہتا کہ گھر کی رکھوالی کرنے کے لئے میں ہوں نا...........اور........

آج پو پھٹتے ہی جب ہمیں ایک رشتہ دار کے انتقال کی خبر فون پہ ملی تو ہم نے پہلی بار نورا کو اکیلے گھر میں سکون سے بیٹھے کی تلقین کرتے ہوئے باہری دروازے کے آس پاس گھومتے ہوئے شیرو پر ایک نظر ڈال کر شام تک کے لئے گھر کو الوداع کہہ دیا۔ اور جب ہم اُس دن سورج ڈھلے سے پہلے افسردہ اور تھکے ماندے گھر پہنچے تو ہم نے نہ صرف باہری دروازے کو مقفل پایا بلکہ شیرو کو بھی کچھ بجھا بجھا سا دیکھا۔ پاس کے ایک پڑوسی نے جو شاید ہمارے ہی گاڑی کا انتظار کر رہا تھا جب قریب آکر یہ خبر سنائی کہ نورا کو شیرو نے بری طرح سے زخمی کر دیا ہے اور محلے کے کچھ نوجوان اُسے ہسپتال میں بھرتی کر چکے ہیں اور یہ تالا بھی اُسی نیک ہمسائے کی بیوی نے لگایا ہے تو ہمارے پیروں تلے جیسے زمین ہی کھسک گئی۔ ہم نے شیرو کی جانب قہر بھری نظروں سے دیکھا۔ نہ جانے یہ کتا آج پاگل پن کی حدوں کو چھو کر کیوں اپنی جبلت کا شکار بن چکا تھا۔ میں تلملا اُٹھا اور میں ایک بڑا سا پتھر لیکر اُس پہ برس پڑا۔ شیرا پتھر کی چوٹ کھا کر چیختا ہوا بھاگ گیا۔ ۔۔۔ میری بیوی نے نیک ہمسائے سے چابی تو لی لیکن ہم دونوں اُلٹے پاؤں اپنی کار میں سوار ہو کر ہسپتال کی جانب روانہ ہوئے۔

ہسپتال پہنچ کر میں نے نورا کی جو حالت دیکھی وہ نا قابل بیان تھی۔ اُسکے بازو، ٹانگیں اور گردن کا ایک حصہ شیرو نے اس حد تک زخمی کر دیا تھا کہ وہ درد سے اب بھی چلاّ رہا تھا حالانکہ ہمسائے کے مطابق یہ واقعہ دوپہر کے وقت رونما ہوا تھا۔ آوارہ کتا ہونے کی وجہ سے ڈاکٹروں نے جو Anti Rabies انجکشن اُسکے پیٹ میں لگایا

تھا اُس سے بھی اُس کے درد میں اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ بری طرح سے رو رہا تھا۔ میں نے اُسے دلاسہ دیا اور میری بیوی جب اُسکے سرہانے مشفق انداز میں بیٹھ کر اُ کے آنسوؤں پونچھنے لگی تو نہ جانے کیوں مجھے کچھ دیر کے لئے ایسا لگا کہ نورا سچ مچ ہمارا ہی بیٹا ہے۔ میں نے جب ہسپتال کے ایک شناسا ڈاکٹر سے بات کی تو اُسنے نورا کو ایک اور انجکشن لگانے کا مشورہ دیتے ہوئے یہ حامی بھی بھرلی کہ ہم چاہیں تو اسے گھر بھی منتقل کر سکتے ہیں لیکن انجکشن لگانے کے لئے اُسے کئی دنوں تک ہسپتال لانا پڑے گا۔ ہم نے ایک سٹریچر منگوائی اُسے باہر گاڑی تک لے جانے کے لئے کچھ ہسپتال کے کرمچاریوں کی بھی مدد لی گئی۔ اور جب وہ کرمچاری اُسے میری کار میں شفٹ کرنے لگے تو اچانک نورا کے کسی اندرونی جیب سے کوئی چیز گری۔ میں جب پاس جا کر اُسے اُٹھانے نیچے جھک پڑا تو مجھے ایسا لگا جیسے میری کمر ہمیشہ کے لئے ٹوٹ گئی ہو۔ زمین پر میری بیوی کی ایک طلائی زنجیر ایک کاغذ میں لپٹی تھی۔

میں نورا اور اُسکی چرائی ہوئی زنجیر کو لیکر کب بیوی کے ساتھ گھر پہنچا مجھے معلوم نہ تھا لیکن ہمارے گھر کے دروازے کے پاس پہنچتے پہنچتے نورا انجکشن کے زیر اثر نہ صرف سو چکا تھا بلکہ میرے ذہن کے پردے پر اُسکی وہ من موہنی تصویر بھی دھندلی ہو چکی تھی۔

او.........دروازے کے باہر شیرو اپنے زخم کو چاٹتا ہوا اب بھی ویسے ہی موجود تھا جیسے وہ اکثر ہماری واپسی کے وقت موجود رہتا تھا۔ نہ جانے میں کیوں اُس سے نظریں نہ ملا سکا۔ ☆☆

(جون ۲۰۰۷ء)

نوٹ آف انٹروگیشن (؟)

وہ سفید پوشوں کی بستی کا آخری آدمی تھا
باقی سارے لوگ اُن سانپوں کے شکار ہو چکے تھے جو سیاہ پوشوں نے اُنکی بستی میں ڈال دئے تھے۔

آج کی رات بھی باہر ایک خوفناک سناٹا تھا اور وہ اپنے تنہا کمرے کے تاریک گوشے میں یہ بات جان چکا تھا کہ اب اُسکی باری ہے۔ کیونکہ آدم خور سانپ اب اُسکے گھر کے اردگرد ڈیرا ڈالنے کا فیصلہ کر چکے ہونگے.... بس اُسے نگلنے کے بعد اس ساری دنیا پر اُن آدم خور سیاہ پوشوں کا راج قائم ہو جائے گا اور کیا معلوم کہ کسی تاریخ کے صفحے پہ سفید پوشوں کا ذکر بھی ہو یا نہیں۔

آج وہ ایک فیصلہ لے چکا تھا کہ وہ سحر کی پہلی کرن نمودار ہونے سے پہلے ہی اپنی اس بستی سے دور، گریبان کے تمام چاک رفو کرنے کے لئے کسی انجان جنگل کی طرف بھاگ جائے گا جہاں جانور انسانوں سے بہتر زندگی گزار رہے تھے اور یوں............

سورج کی پہلی کرن نمودار ہونے سے پہلے ہی جب اُس نے اپنے گھر کے دروازے کے پٹ وا کردئے تو کئی سانپ پھن پھیلائے ہوئے اُس کے منتظر تھے

''رکو....'' وہ رک گیا

کہاں جا رہے ہو....ایک سوال جس کا جواب اُسے خود بھی معلوم نہیں تھا۔

اُس نے جواب نہیں دیا بلکہ اندر ہی اندر جیسے اپنا جواب تراش رہا ہو۔۔۔۔گھر میں کیا رکھا ہوا ہے....اس جواب سے پہلے اُس کے لئے پیچھے مڑ کے دیکھنا ضروری تھا لیکن اُس کی گردن تو برسوں سے اکڑی ہوئی تھی وہ صرف آگے دیکھ سکتا تھا۔ نہ دائیں، نہ بائیں اور اسی لئے اُس نے شاید صرف اپنے مستقبل کے بارے میں سوچا تھا۔ نئ سحر کی اُمید لئے ۔نئے منزلوں کی بس ایک موہوم سی آرزو لیکر۔۔۔۔۔

اب سیاہ پوش اُسکے سامنے پھن پھیلائے کھڑا تھا۔۔۔۔وہ نہ اُس کے لئے شناسا تھا اور نہ ہی اجنبی۔

سوال پوچھنے کا حق سب کو ہے۔ یہ وہ خود بھی جانتا تھا لیکن جواب دینے کے لئے کوئی کسی کو مجبور کردے اس بات کا احساس اُسے تب ہوا جب اُس سیاہ پوش نے اُسکے گریبان کو پکڑ کے اب اُس سے ایک ترش لہجے میں پوچھا

''بولو....جواب کیوں نہیں دیتے....میں تم سے کچھ پوچھ رہا ہوں''

یہ تو اُسے بھی معلوم تھا کہ وہ اُس سے کچھ پوچھ رہا ہے۔ کیونکہ برسوں سے اُس کی بستی کے ہر نکڑ پہ سوالات ہی سوالات نظر آتے ہیں ۔ اُلٹے سیدھے۔ تیکھے، تند، آڑھے ترچھے۔صرف سوالات۔۔جیسے سوالات نہ ہوں گلیوں اور شاہراؤں پہ گھومتے ہوئے ناگ ہوں جنہیں راہگیر کو ڈسنے کا شوق چرایا ہو .وراسی دہشت نے تو اُسے بھی برسوں سے جکڑا تھا اور آج جب وہ وہ پو پھٹتے ہی اس وحشی حصار سے بھاگنے کی جسارت کر بیٹھا تھا تو اُسے وہ نظر آیا تھا...وہ جو شاید رات بھر اُس کے گھر کے دروازے پہ نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ وہی سیاہ دل والا سیاہ پوش.............

اُس کے گریبان پر گرفت اور سخت ہوگئی لیکن وہ خاموش بت بنا اپنے ہی ماضی، حال اور مستقبل کی اندھی گلیوں میں بھٹکتا رہا اور اچانک وہ ایک ٹھوکر کھا کر گر پڑا..........

سیاہ پوش نے اُسکے منہ پر ایک زوردار طمانچہ مارا تھا... وہ تلملا کر جیسے خواب غفلت سے جاگ اُٹھا۔ گریبان پہ گرفت ختم ہو چکی تھی لیکن اُسکے گال پہ سرخی مائل عکس اُبھر چکا تھا۔ اُسے ایسا لگا کہ اُس کے سارے جسم کا خون اُس عکس کے ارگرد اُبل رہا ہو اور اچانک............

نہ جانے اُس کے ہاتھ کا ایک زوردار تھپڑ جسنے خاموش سحر کے سنّاٹے میں ایک گونج پیدا کردی کہاں سے اُبھرا تھا۔۔ اُسکے لاشعور سے یا پھر کہیں تحت الشعور سے ......۔ یہ تھپڑ اُسنے سیاہ پوش کے منہ پہ رسید کردیا تھا ایک ایسا تھپڑ جسنے شاید اُسکے سارے دانت ہلا کے رکھ دیئے تھے۔ سیاہ پوش مبہوت ہو کے رہ گیا تھا..اور اسی لمحے۔۔۔۔۔

سفید پوش کے منہ سے کچھ سانپ باہر لپکنے لگے تھے۔ سوالوں کے خوف ناک سیاہ ناگ اور پلک جھپکتے ہی یہ سارے ناگ سیاہ پوشوں کی دنیا میں چھا گئے۔☆☆☆

(ستمبر ۲۰۰۸ء)

وزیٹنگ کارڈ

وہ کچھ پڑھ رہا تھا... یا پھر شاید کوئی عبارت اُسے اپنی جانب راغب کرنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن عبارت کا بدن دھندلی روشنی میں صاف دکھائی نہیں دے رہا تھا... اُس نے میز پر رکھے کولڈ ڈرنک کے ادھ بھرے گلاس کو اپنے ہونٹوں سے لگاتے ہوئے نگاہیں بدستور اُس وزیٹنگ کارڈ کی جانب مرکوز رکھیں جس کی عبارت پچھلے پانچ منٹوں سے اُسے اپنی جانب متوجہ کر رہی تھی لیکن وہ کہیں اور کھویا ہوا تھا۔

اچانک اُسے اپنے رگ وپے میں کولڈ ڈرنک کی سرد سنسناتی ہوئی لہریوں محسوس ہوئی جیسے اُسکے عریاں جسم کو کسی نے برف کی موٹی سل پہ لٹا دیا ہو..... وہ کتاب کا ہر حرف، ہر زاویہ، ہر نقطہ، ہر لکیر کا عکس اپنی یادداشت کے ایک محیط بیکراں سے نکال کے لایا تھا...وہ وزیٹنگ کارڈ اب اُسکے لئے دھیمی دھمی روشنی میں کچھ عیاں کچھ پنہاں کے حصار سے باہر آچکا تھی۔.....زرینہ...

ایک یاد، ایک خلش، ایک آرزو، ایک جستجو اور ایک منزل...جو اُسکے قریب آکر بھی اُس سے بہت دور جا چکی تھی..جو اُس کی نس نس میں سما کر بھی اُسکے وجود کو چیرتی ہوئی نہ جانے کن ہواؤں میں تحلیل ہو گئی تھی... برسوں پہلے کی وہ سرمئی سی شام اب اس ریسٹورنٹ میں پوری طرح سے چھا گئی تھی..ایسا ہی ایک خوبصورت ریسٹورنٹ تو وہ بھی تھا

جہاں اُس نے پہلی بار ایک پیکر حسن اور مجسمہ اخلاق کو دیکھا تھا.....اُس شام زرینہ اپنے ایک رشتہ دار کی شادی کی پارٹی میں اس ریسٹورنٹ میں اپنی کچھ سہیلیوں کے ساتھ ہاتھ میں کھانے کی پلیٹ لئے بظاہر خاموش سی ایک کونے میں کھڑی تھی اور وہ..وہ بھی تو اُسی شادی میں ایک مہمان کی حثیت سے آیا تھا۔ ولیمہ کی پارٹی تھی۔ دولہا دلہن ایک خوبصورت سٹیج پر سلطانی دور کی یاد دلاتی ہوئی خوبصورت کرسیوں پر دیکھنے والے کو رشک نزاکت و وجاہت کا اسیر بنا رہے تھے لیکن اب..اُسے دیکھ کر وہ جیسے پارٹی میں شامل ہر چہرے سے بے نیاز ہو گیا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں بھی کھانے کی پلیٹ تھی جس میں کشمیری وازہ وان کی کچھ ضیافتیں اپنا مہکتا احساس ہر سو بکھیر رہی تھیں لیکن اب وہ اُن ضیافتوں سے بھی، اُس مہک سے بھی بے نیاز ہو چکا تھا...

نہ جانے یہ نگاہوں کی فطرت تھی یا اُسکے دل کا ایک انجان سا احساس کہ اُس پارٹی کے بعد اُسے ہر طرف بس وہ نظر آ رہی تھی...وہ...جسکا نام بھی وہ جاننے کی جرات نہ کر سکا تھا...کئی بار اُس پارٹی میں وہ ایسے ہی جھوٹ موٹ کا بہانہ بنا کر اُسکے قریب سے گزرا تھا، کئی بار اُس نے اپنے کچھ شناساؤں سے اس پیکر حسن کے بارے میں کچھ مختصر یا کچھ مکمل جاننے کا ارادہ بھی کر لیا تھا لیکن بنیادی طور پر ایک شریف گھر کا فرد ہونے کے ناطے اس تاک جھانک اور پوچھ تاچھ کو ''غیر شایستہ'' سمجھ کر اپنے اندر کے طوفان کو روکتا ہوا پارٹی کے اختتام تک بس کن انکھیوں سے اُس پری پیکر کو دیکھتا رہا اور جب وہ دلہن اور دولہے کی روانگی کے ساتھ ہی وہ چند سہلیوں کے ساتھ روانہ ہوگئی تو وہ بھی مرکز نگاہ کے فسوں سے آزاد ہو گیا........لیکن اُس کا دل، اُسکا ذہن اور اُسکے اندر کا کوئی انجان سا گوشہ اُسکی یاد سے نجات حاصل نہ کر سکا، یوں نہ جانے کتنے ماہ و سال گزر گئے، شرافت یا

پھر بزدلی کا وہ پردہ اُسکے تمام ارادوں کے روبرو حائل رہا...وہ ویسے بھی سارے خاندان میں کم گو، شریف النفس اور شرمیلا تصور ہوتا تھا، اکثر اُسکے خاندان کی بوڑھی عورتیں یا جوان لڑکیاں اُسے شاہد نکھٹو یا شاہد شرمیلے کے نام سے چڑاتی رہتی تھیں اور وہ...اُن کی شرارتوں سے لطف اندوز ہونے کی بجائے اُن سے جان چھڑانے کی سعی کرتا رہتا تھا، ایک دن تو حد ہی ہوگئی تھی جب اُسکی ایک خالہ زاد بہن رقیہ جو خیر سے اپنے شوہر نامدار جو پیشے سے ڈاکٹر تھا کے ساتھ انگلینڈ کے ترقی یافتہ، جدیدیت کے رنگوں سے رنگے ہوئے ماحول میں رہتی تھی کچھ دنوں کے لئے اپنے آبائی گھر آئی تھی۔ وہ شاہد میاں کے گھر بھی کچھ تحایف لیکر آگئی تو اُسنے بھی حسب روایت شاہد کو ہی چھیڑنے کی کوشش کی... اور یہ چھیڑ خوانی چونکہ مغرب و مشرق کی متضاد تہذیبوں کے درمیان ایک جنگ کا سماں پیش کرنے لگی تو ایک لمحے کے لئے گھر کے لوگوں کو بھی جو رقیہ کے اعزاز میں دیئے گئے عشائیے میں اپنی تمام تر شگفتگی کے ساتھ موجود تھے ایسا لگنے لگا تھا کہ ابھی مشرق کی شایستہ، نازک اور خوبصورت قدریں، مغرب کی بناوٹی دنیا کو اس بات کا احساس دلا دینگی کہ پھولوں کا پیکر تو کسی نہ کسی رنگدار کاغذ سے تراشا جاسکتا ہے لیکن، خوشبو اور نزاکت کا احساس قدرتی پھول کی قسمت میں ہی لکھا ہے۔۔ خود رقیہ کو بھی شاہد کے مختصر اور دبے دبے لہجے میں اُسکے شرمیلے پن کی منطق نظر آنے لگی تھی لیکن کھانے کی میز پہ بیٹھی ہوئی مہمان اپنے تمام میز بانوں کے ساتھ یہ دیکھ کے سکتے میں آگئی کہ شاہد کی آنکھوں سے دو موٹے موٹے آنسو بہنہ رہے تھے اور وہ ایک عجیب سے لہجے میں جس میں التجا، فریاد اور بے بسی کے تمام رنگ نمایاں تھے رقیہ سے بنا آنکھ ملائے بس اتنا کہہ کر کھانے سے میز سے اُٹھ گیا

''رقیہ بہن ... میں جیسا ہوں بس ویسا ہی ٹھیک ہوں۔ کیونکہ مجھے بھی تو رب نے ہی

بنایا ہے۔ اور نعوذ باللہ رب کسی کو غلط تو نہیں بنتا''

شاہد یہ کہہ اُٹھ چکا تھا اور کچھ ہاتھ نوالہ لئے منہ کے پاس ساکت ہو گئے تھے، اور کچھ منہ حیرت اور ہمدردی کے ملے جلے ذایقے کو محسوس کر کے وا ہو چکے تھے... رقیہ نہ جانے کیوں اپنے آپ کو گناہ گار سمجھنے لگی تھی یہ تو بھلا ہو شاہد کے والد عثمان صاحب کا کہ اُنہوں نے ایک مرجھائی سی ہنسی کو اپنے لبوں پہ بکھیرتے ہوئے اس تمام بحث و مباحثہ کو ایک دلچسپ نوک جھونک کا نام دے دیا. چند لمحوں کے بعد گھر کی شائستگی نے مہمان کی عزت کی خاطر ماحول کو یاسیت کی کیفیت سے آزاد تو کر دیا لیکن رقیہ اُس رات اپنے گھر لوٹنے سے پہلے شاہد سے معافی مانگنے کا ارادہ کر چکی تھی لیکن اپنی موٹر میں بیٹھنے تک اُسے پورے گھر میں نہ شاہد ہی نظر آیا اور نہ ہی اُسکی پرچھائی۔ شاہد کی بڑی بہن سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ کھانے کی میز سے اُٹھ کے سیدھے اپنے کسی دوست کے گھر چلا گیا ہے اور فون پر یہ اطلاع بھی دے چکا ہے کہ وہ اب گھر علی الصبح ہی آئے گا۔ افسردہ رقیہ بوجھل قدموں سے روانہ ہو گئی اور یہ بھی ایک اتفاق ہی ہوا کہ اُس شام کے بعد اُسنے کئی برسوں تک اپنے خالہ زاد بھائی شاہد کو تب تک نہ دیکھا جب تک وہ دولہے کے روپ میں اپنے دوستوں کے ساتھ اُسی شرمیلی ادا کے ساتھ بظاہر گم صم بیٹھا تھا...... رقیہ کو اب کے بھی اُس سے معافی مانگنے کا موقع نہ مل سکا کیونکہ شادی کے فوراً بعد شاہد کو اُس کی بیوی کے ساتھ دوسرے ہی دن اپنی ایک اچھی خاصی نوکری کو جوائین کرنے کے لئے ممبئی جانا پڑا۔ شاہد کو یہ نوکری شادی کی تاریخ سے کچھ دن پہلے ہی ملی تھی اور جوائین کرنے کے لئے اُس کے پاس اب زیادہ مہلت بھی نہیں تھی۔ یوں رقیہ کے ساتھ ساتھ سب گھر والوں کو اپنے مخصوص شرمیلے انداز میں الوداع کہہ کر وہ اپنی خوبصورت بیوی کے ساتھ ممبئی کی جانب

روانہ ہوا اور رقیہ اُسکے چہرے میں ماضی کی کسی لکیر کو تلاش بھی کر سکی جسے دیکھ کر وہ کم از کم اس بات کا اندازہ لگا سکتی کہ آیا اُسکا بھائی اُسکے تئیں اپنے دل میں کون سا جذبہ پالے ہوئے ہے۔

ممبئی کی حسین دنیا میں اپنی نئی نویلی دلہن کے ساتھ پہنچ کر بظاہر شاہد نے ایک تو نئے ماحول کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا ور دوسرے اپنی بیوی کو بھی کبھی شکایت کرنے کا موقع نہ دیا لیکن ...وہ ایک لمحہ...وہ ایک لمحہ آج بھی اُسے اندر ہی اندر کریدرہا تھا...وہ لمحہ جب ایک پیکر حسن اُسکی نگاہوں کو اپنی تپش سے خیرہ کر گیا تھا۔ جب اُسے پہلی بار ایسا محسوس ہوا تھا کہ وہ زندگی کی ایک حسین کیفیت اور ایک حسین جذبے سے پہلی بار آشنا ہوا ہے...وہ لمحہ، وہ خلش ، وہ تڑپ اُسے اپنی بیوی کی محبت، خدمت اور وفا شعاری سے زیادہ اچھی لگتی تھی۔ وہ اکثر اُس چہرے کو یاد کرتا رہتا جسے اُس نے صرف ایک بار دیکھا تھا اور جس کے بارے میں اُسے کچھ معلوم نہیں تھا جبکہ دوسری جانب ایک اور حسین مورت دن رات اُس کے لئے پلکیں بچھائے ، اُسکی آمد کی منتظر اُس کی ایک مسکراہٹ پہ سب کچھ قربان کرنے کے لئے اُس کے قریب...بہت قریب تھی لیکن وہ تھا کہ ایک خلیج کی انجانی گہرائیوں میں دھنستا ہی چلا جارہا تھا، کبھی کبھار تو اُسکی وفا شعار بیوی نے اُسکے لمس میں ایک انجانی بے نیازی کو بھی محسوس کیا تھا لیکن وہ چپ سادھ لینے میں ہی اپنی وفا کا معراج تلاشنے لگی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اُسکا شوہر خاموشی کو ہی زیادہ پسند کرتا ہے اسی لئے تو اُن کا وہ کوارٹر جو اُنہیں اُسی کمپنی کی طرف سے ملا تھا جس میں اُسکا ذہین شوہر انجینئرنگ کے عہدے پہ تعینات تھا بمبئی کے پر شور ماحول میں بھی ایک ایسی تصویر کا عکس پیش کررہا تھا جو خاموش رہ کر بھی اپنے سارے رنگوں کو اُجاگر کر رہی تھی۔ اور بلا مبالغہ اُس گھر کے ہر گوشے میں خوشی اور

سکون کے سارے رنگ جلوہ گر تھے سوائے ایک شاہد کے دل کے اُس پنہاں گوشے کے جس میں ایک حسین خیال کبھی کبھار ایک ارتعاش پیدا کر دیتا تھا۔

ممبئی کے ماحول میں ایک دن ساری خاموشیاں اُس وقت شاہد کی زندگی میں تلاطم بپا کرنے میں کامیاب ہوگئیں جب ایک لوکل ٹرین میں اُسے وہ نظر آئی۔ ہاں وہی جسے اُس نے ایک دن اُس شادی میں دیکھا تھا۔ ہاں وہ وہی تو تھی۔ لیکن نہ جانے کیوں شاہد کو اُس کے بدن پہ نکھرے نکھرے سے وہ آدھے ادھورے کپڑے اچھے نہیں لگے۔ نہ جانے کیوں اُسے اُس کا وہ نیم عریاں سا بدن دیکھنے کی جرأت نہ ہوئی۔ وہ اُسے بس کچھ لمحوں کے لئے ہی دیکھ پایا اور جب ایک سٹیشن پر وہ اُترنے لگی تو شاہد نے پہلی بار پھرتی سے کام لیکر بنا یہ سوچے کہ وہ سٹیشن اُس کی منزل نہیں ٹرین سے باہر کود کر اُسے پلیٹ فارم پہ ہی جالیا۔

''سنیئے'' نہ جانے شاہد کے اندر اتنی ساری ہمت کہاں سے آ گئی تھی۔

''جی'' وہ بنا کسی حیرت اور ناگواری کے اُس سے مخاطب ہوئی

''میں۔۔وہ......آپ شاید مجھے نہیں جانتی'' شاہد کی ہمت بڑھنے لگی

''کیا ضروری ہے کہ میں آپ کو جان لوں.. کہیے... میں آپ کے لئے کیا کرسکتی ہوں لیکن پلیز جلدی کہیے گا میں آل ریڈی لیٹ ہوں''

''وہ آپ اور میں۔۔۔اُس.....''

''اوہو لگتا ہے آپ بہت ہی زیادہ شرمیلے ہیں۔ سنیئے یہ میرا کارڈ ہے۔آپ جب چاہئیں مجھے کال کریں اور اپنے دل کی بات آرام سے کہیں...او کے'' وہ ایک خوبصورت سا کارڈ اُس کے ہاتھ میں دے کر ایک ادائے بے نیازی سے مسکراتی ہوئی

جوں ہی جانے لگی شاہد نے ایک بار اپنے اندر کی ساری ہمت مجتمع کر کے اُس سے پوچھ ہی لیا

''وہ میں آپ کو...

شاہد کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی وہ پھر بے ساختگی سے بول پڑی ''اوہو اب آپ ......یہ......میں، آپ والے ادھورے جملے چھوڑیئے اور میرے اس کارڈ کو گھر جا کر آرام سے دیکھیے... میرے موبائل پہ مجھے شام سے پہلے فون کیجئے۔ اپنا پتہ لکھوائے اور بس کال گرل حاضر..او کے بائی... آج اپوینٹمنٹ ہے سوسی یوانی ٹائم so see you any time''

شاہد کو ایسا لگا کہ اس چھوٹے سے ریلوے سٹیشن کو کسی نے بم دھماکے سے اُڑا دیا ہو......اور وہ..............................☆☆

(نومبر۲۰۰۸ء)

بے نام

میری ادبی زندگی کا پہلا افسانہ

تاریخ اشاعت: ۱۹ر ستمبر ۱۹۷۵ء (روزنامہ آفتاب)

''قسمت کا چکر بھی عجیب ہے... کسی کو یہ پنکھے کی فرحت بخش ہوا میسر کرتا ہے اور کسی کا جسم و جگر چھلنی کر کے رکھ دیتا ہے''

وہ عجیب اور مایوسانہ انداز میں کہے جا رہا تھا۔ گاڑی کے انجن کے شور میں مجھے اُس کی آواز دور کسی گنبد سے نکلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اُس کا وجود تپتے جون کی گرمی میں میرے جسم کے رگ و ریشے میں گرمی کی ایک لہر دوڑا رہا تھا اور میرا اپنا وجود بھی شائد اسی فعل کا مرتکب ہو رہا تھا۔

وہ تھوڑی دیر پہلے گذرے ہوئے بس سٹیشن سے گاڑی میں سوار ہو کر میرے پہلو میں بیٹھ چکا تھا۔

سیدھے سادھے کپڑوں میں ملبوس۔ غم اور تکلیف کے رنگوں میں ڈھلا ہوا مایوس چہرہ۔ گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی آنکھیں۔ سیدھے مگر قدرے آراستہ بال اور ہاتھ میں تھمے ہوئے کاغذوں کا پلندہ جیسے کہ وہ اُس کا کُل اثاثہ ہو۔

''یہ پلندہ...'' وہ ہاتھ کو تھوڑی سی جنبش دیتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوا'' یہ پلندہ! جسے حاصل کرتے ہوئے میں نے بے حد مسرت محسوس کی تھی اب میرے لئے ایک بوجھ بن چکا ہے..آپ کو کیسے بتاؤں کہ میں نے یہ پلندہ حاصل کرنے کے لئے کیا کیا مصیبتیں جھیلیں ہیں۔ میری زندگی کی ہزاروں راتیں اور ہزاروں دن اس پلندے کی نذر ہو گئے ہیں لیکن ... مجھے اس پلندے نے آج تک دیا کیا ہے.. مفلسی، مایوسی اور گھٹن...صاحب یہ قسمت کا چکر بھی عجیب ہے....''

وہ ہاتھ میں تھمے چار مینار سگریٹ کا کش لیکر اپنی زندگی کی کتاب کے اوراق اُلٹتا رہا۔

''میں نے زندگی میں اوروں کی طرح ہزاروں سپنے نہیں سجائے تھے۔ میں نے ایک چھوٹی سی خوشحال سی زندگی چاہی تھی لیکن یہ جھولیاں جو اپنے ساتھ خالی تقدیر لاتی ہیں ان جھولیوں کو کوئی بھر نہیں سکتا۔ اگر خدا کو ان جھولیوں پہ ترس آنا ہوتا تو پھر ان کی قسمت میں ''خالی'' لفظ لکھتا ہی کیوں؟......میری زندگی کے وہ دن......ماضی کی وہ تلخ یادیں میں کیسے بھول سکتا ہوں۔

میری ماں جو میری خوشحال زندگی کا انتظار کرتے کرتے تھک گئی، جسکی آنکھیں میری ایک خوشی کی راہ تکتے تکتے بند ہو گئیں اور ایک دن وہ خوشی اور غم کے احساس سے ہمیشہ کے لئے آزاد ہو گئی.........

......میری بھولی بھالی معصوم بہن، جو ماں کی میت سے لپٹ کر ماں کے دودھ کا ایک ایک قطرہ آنسوؤں کی شکل میں بہاتی رہی اور ایک دن وہی آنسوؤں سے اپنے ساتھ بہا کر لے گئے.........

....ہمارا وہ چھوٹا سا مکان، میری پڑھائی کا بوجھ برداشت نہ کرتے ہوئے ایک دن ساہوکار کی ملکیت میں چلا گیا اور ہم.....

...زندگی کی اُلجھنوں میں پھنسا ہوا، پیچ دار راہوں پر چلتے چلتے تھکا ہارا میرا باپ اسی بوجھ تلے ہمیشہ کے لئے دب گیا..........

.......نہیں صاحب...نہیں...یہ زخم کبھی بھر نہیں سکتے...''

''لیکن آج کل آپ کیا کر رہے ہیں؟'' بوجھل اور روہانسی آواز کے ساتھ میرے لب کھلے۔

گاڑی اسی لمحے ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔ شاید کسی سواری کو اُترنا تھا، میرے ہمسفر نے قرب و جوار کا جائزہ لیا اور سیٹ سے اُٹھ کھڑا ہوا، شاید اُسکی منزل آگئی تھی۔ اُس نے کاغذ کے پلندے کو مضبوطی سے تھام کر میرے آخری سوال کا مختصر سا جواب دیا

''منزل پر پہنچنے کی آخری کوشش''

''آپ کا نام؟...'' میرا سوال میرے لبوں پر آتے آتے اٹک گیا..وہ بس سے اُتر چکا تھا

ڈرائیور اُس کے اُترتے ہی ابھی اپنی گاڑی اسٹارٹ بھی نہ کر چکا تھا کہ فضا میں ایک دلدوز چیخ اُبھری..بس میں بیٹھی سواریاں خوفزدہ انداز میں چونک پڑیں۔ ڈرائیور کھڑکی کھول کر نیچے کود پڑا

''حادثہ....'' کسی کی آواز کانوں سے ٹکرائی جیسے کہیں بم پھٹ گیا ہو

میں بھی عجلت میں گاڑی سے نیچے اُتر آیا اور سامنے جمع بھیڑ کو چیرتا ہوا آجائے

واردات پہ پہنچا۔ بس کے بالکل قریب ایک ٹرک کے پہیے کے پاس اُس کی لاش پڑی تھی..

لاش کے قریب کاغذ کا پلندہ یونیورسٹی سرٹیفکیٹس کی شکل میں کھلا پڑا تھا۔ سرٹیفکیٹس پر خون کے موٹے دھبے پڑے تھے اور مقتول کا نام کسی بھی سرٹیفکیٹ پر نمایاں نہ تھا۔

میں نے خون میں لت پت اُسکے معصوم چہرے کی جانب دیکھا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ میرے آخری سوال کا جواب دے رہا ہو۔

''مظلوم کا کوئی نام نہیں ہوتا صاحب...وہ بے نام ہوتا ہے'' ☆☆

مصنف کی دیگر تصنیفات

☆ پہلا شعری مجموعہ ''ابتدا'' (۱۹۸۴ء)

☆ ناول ''خوشبو کا سفر'' (۱۹۸۶ء)

☆ شعری مجموعہ ''سلگتے چنار'' (۲۰۰۴ء)

☆ افسانوی مجموعہ ''جہلم کا تیسرا کنارا'' (۲۰۰۵ء)

☆ شعری مجموعہ ''بھیگی بھیگی پلکیں'' (۲۰۰۵ء)

☆ طویل نظم ''اجنبی شہر کے اجنبی راستے'' (۲۰۰۶ء)

☆ کشمیری شعری مجموعہ ''تنبرِ ہلم'' (۲۰۰۹ء)

تخلیق کے گھاؤ

(میرا پہلا افسانہ جو کسی میگزین (شیرازہ ۱۹۷۷ء) میں شایع ہوا ہے)

میں نے آنکھیں کھول کر جب اپنے ماحول کا جائزہ لینا چاہا تو مجھے اندھیرے کے سوا کچھ نظر نہ آیا بلکہ صحیح معنوں میں میں صرف اندھیرے کو محسوس کر سکا...ایک ایسا بھیانک اندھیرا جس میں میرا اپنا وجود بھی جذب ہو کے رہ گیا تھا۔ میں نے چھو کر اپنے وجود کو ٹٹولنا چاہا لیکن میرے ہاتھ پاؤں جیسے کسی انجانی کشش سے جکڑے ہوئے تھے... میں نے پھر ایک بار اندھیرے کو نظروں سے چیرنا چاہا لیکن اندھیرے نگاہوں کے سامنے فولادی دیوار بن کر کھڑے تھے۔

''ویسا ہی بھیانک اندھیرا'' نہ جانے ذہن ماضی کی ایک دھندلی سی یاد میں کیوں کھو گیا جیسے اندھیرے کو محسوس کر کے ماضی کی کوئی ہیبت ناک داستان یاد آ گئی ہو۔

وہ بھیانک اندھیرا اور اُس گدلے پانی میں میرا تیرتا ہوا وجود...نہ جانے کتنی مدت تک میں اُس اندھیرے کا قیدی بنا رہتا کہ قدرت نے میری رہائی کا سامان مرتب کر کے ایک انجانی قوت کے ذریعے مجھے اُس قید سے نجات دلا دی۔

مجھے اب بھی وہ دن یاد آ کے ایک خوف بھری تھرتھراہٹ کا شکار بنا دیتا ہے...

اُس دن جب میں نے پہلی بار روشنی میں آنکھیں کھول کر رونا شروع کیا تھا...
جیسے کوئی ظلم سہتے سہتے اپنوں کے بیچ آ کر کوئی دل کا دکھڑا بیان کرنا چاہتا ہو۔

اُجالے کی کرنوں سے مانوس ہوتے ہوتے میری حیثیت ایک کھلونے سے کم نہ رہی۔ میں زندگی کے کارواں کو تکتا رہ گیا اور میری اپنی زندگی دوسروں کے دل بہلانے کا ذریعہ بن گئی۔ رفتہ رفتہ میں اُجالے کے سینے میں چھپے درد سے آشنا ہوتا گیا۔ آہوں، سسکیوں اور چیختے چلاتے انسانوں کی آہ و بکا سے بھرے مناظر......... تڑپتی مچلتی آرزوؤں کے مزار میری آنکھوں کے سامنے گردش کرنے لگے اور نہ جانے کیوں مجھے اُس اُجالے سے اور اُس اُجالے کی کرنوں سے اور خود اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی۔ مجھے وہ اُجالے اندھیروں سے بھی بھیانک لگنے لگے تھے اور میں زندگی کی قید سے آزاد ہونے کے لئے مچلنے لگا لیکن..............

تب تک بہت وقت گذر چکا تھا.......... میرے اردگرد محبت، فرض اور ممتا کا ایک حصار تعمیر ہو چکا تھا جسے عبور کرنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔

وقت کروٹیں بدلتا رہا، میں اُس ظلم وستم کی چکی میں پِستا چلا گیا اور ایک رات...
میرے تڑپتے، مچلتے وجود نے ایک نئے کردار کو جنم دیا۔ ایک ایسے دردمند کردار کو جو دوسروں کا معمولی دکھ بھی برداشت نہ کر سکتا تھا۔ ایک ایسے نڈر کردار کو جو تلخ حقیقتوں کو بے نقاب کرنے کے دوران کوئی ڈر، کوئی خوف یا کوئی جھجک محسوس نہ کرتا تھا لیکن..............

دنیا نے اُسے بھی چین کا ایک لمحہ میسر نہ ہونے دیا۔ اُسے ساتویں آسمان پر پہنچا کر مجلسوں اور جلسہ گاہوں کی رونق بنا کر۔ اقتدار تک پہنچنے کی سیڑھی بنا دیا گیا۔ دنیا نے

اُس کردار کو اُس کے اپنے ضمیر کے آہنی پنجوں کا اسیر بنا دیا۔

لوگ اُس کی ایک جھلک کے شیدائی بن گئے اور وہ خود اپنے آپ سے بے خبر ہوتا چلا گیا اور یوں ایک دن اُس نے اس تمام گہما گہی، دوڑ دھوپ سے بغاوت کردی............اُس کی بغاوت نے یوں میری زندگی کی وہ آہنی دیوار بھی گرا دی جس میں میں برسوں سے قید تھا....

اچانک میرے خیالوں کا طلسم لوگوں کی دھیمی دھیمی بھنبھناہٹ سے چور چور ہوگیا۔ میں نے آنکھیں پھاڑ کر ایک بار پھر اندھیرے میں کچھ تلاش کرنے کی جستجو کی لیکن اندھیرا اب بھی میری ساری کائنات پہ مسلط تھا صرف ایک دھیمی دھیمی آواز میرے کانوں میں نشتر چبھونے لگی۔

''ہائے بے چارا.. دیکھو کس حال میں پڑا ہے'' کسی کی ہمدردی سے پُر آواز لیکن اسکے ساتھ ہی مجھے اپنا وجود گھڑی اور بٹوے کے بوجھ سے آزاد ہوتا ہوا محسوس ہوا۔

''خدا جنت نصیب کرے'' پھر وہی زہر میں ڈوبا ہوا نشتر۔'' آخر جاتے جاتے بھی کسی کے کام آگیا'' آواز دور ہوتی گئی اور میں نے اپنی ساری سکت مجتمع کر کے استادہ ہونے کی کوشش کی لیکن میں اپنی جگہ سے جنبش بھی نہ کر سکا۔

ماحول پر پھر وہی خوفناک خاموشی طاری ہوگئی اور میں پھر اپنی بے بسی کا ماتم کرنے لگا۔

نہ جانے کتنا وقت گذر گیا۔ اب تو مجھے وقت کے ٹھہرنے کا ہی بس احساس تھا۔

اچانک کسی گاڑی کے رکنے کی آواز میرے کانوں میں گونج اُٹھی۔ کچھ دیر بعد کئی ہاتھوں نے مجھے اُٹھا کر کسی کھردرے فرش پہ لٹا دیا اور چند لمحوں کے بعد میرا وجود اپنی منزل سے

بے خبر کسی انجان راستے پر ہچکولے کھاتا رہا اور میرا ذہن ماضی کی یاد کا کرب سہتا رہا۔ اُس ماضی کی یاد جب میرے ایک ایک لمحے کی قیمت ہوا کرتی تھی لیکن آج.....آج میں....

گاڑی کسی جگہ رک گئی اور میرے وجود کو بھی ہچکولوں سے نجات مل گئی۔ چند لمحوں کے بعد پھر لوگوں کی دھیمی دھیمی بھنبھناہٹ سنائی دینے لگی۔

''جی نہیں، یہ شخص ہمارے لئے اجنبی ہے'' کئی آوازیں اُبھریں۔شاید وہ لوگ مجھے پہچاننے کی کوشش بھی نہیں کر رہے تھے۔ میں نے چلا کر کہنا چاہا ''ارے ظالمو تم مجھے فراموش کر چکے ہو، مجھے۔ جو تمہارا چہیتا قلمکار تھا۔۔جس کی تحریروں کو تم اپنے دل کی آواز کہا کرتے تھے'' لیکن میں ایک لفظ بھی ادا نہ کر سکا، مجھے ایسا لگا جیسے میری زبان کسی نے کاٹ دی ہو۔ یا ہو سکتا ہے مجھ سے میری سماعت اور بصیرت بھی چھین لی گئی ہو۔

میں نے ایک خوفناک جھٹکا کھایا اور جب میری آنکھ کھل گئی تو میں نے اپنے آپ کو لاوارث لاشوں کے بیچ میں پایا...اب مجھے سب کچھ دکھائی دے رہا تھا...اُن لاشوں کے چہروں پر نظر پڑتے ہی مجھے ایسا لگا جیسے میرے سارے جسم پر ہزاروں چیونٹیاں رینگ رہی ہوں۔

وہ سارے چہرے میرے اپنے کرداروں کے چہرے تھے، وہی چہرے جنہیں میں خود تراشا کرتا تھا۔☆☆

گرہن

رات نے ابھی پہلے زینے پہ قدم بھی نہیں رکھا تھا کہ وہ خط اُسکے کمرے میں بجلی بن کے کوند پڑا۔

''میں آپ سے نہ کبھی پیار کرتی تھی، نہ کرتی ہوں اور نہ کرونگی...آپ سے ہنس کر دو باتیں کیا کرلیں کہ آپ نے میرا نام اپنی دل کی کتاب پہ لکھ دیا..اسے خدا کے لئے مٹا دیجئے...''

شاہد آنکھیں ملنے لگا۔ اُسے اپنی بصارت پہ بھی شک ہونے لگا۔ اس خط کے حروف تو اُس کے ذہن میں سما ہی نہیں رہے تھے..آج بھی اُسے زرینہ کے وہ لفظی پیکر اپنے کمرے کی کھڑکیوں سے جھانکتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔

''شاہد، تم میرے ہو صرف میرے۔ تمہارے بغیر تو میری زندگی ادھوری ہے ۔۔میں صرف تمہیں اپنی منزل سمجھتی ہوں''

''تو کب ملن ہوگا اس مسافر کا اپنی منزل سے؟''

''بس تم ڈاکٹر بن جاو...تبھی...میں یہ چند مہینے تمہاری یاد کو سینے سے لگائے جی لونگی۔..تم ڈاکٹر بن کے سب سے پہلے میری تنہائیوں کے زخم ٹھیک کر دینا...کروگے نا؟''

یہ سب زرینہ نے ہی تو کہا تھا۔ شاہد کے کاندھے پہ اپنا سر رکھ کے لیکن آج...

''میں آپ کی ایک ادنیٰ سی ویل ویشر Well wisher تھی۔ بے شک میں نے دعائیں مانگیں تھی کہ آپ ایک اچھے ڈاکٹر بنیں اور آج..آج جب آپ .... مریضوں کی دعائیں لینے اُس نرسنگ ہوم میں اپنی نئی زندگی شروع کرنے جا رہے ہیں تو مجھے بھی بہت خوشی ہو رہی ہے لیکن آپ میری ہمدردی کو محبت کا عنوان بخش دیں۔ آپ ماضی میں ہوئی ہماری کسی بھی بے تکلف ملاقات کو عشق کا نام دیں۔ یہ مجھے منظور نہیں......''

ڈاکٹر شاہد کی نگاہیں اس سطر پہ جم کے رہ گئیں لیکن اُس کا ذہن پھر ایک بار دور ماضی کے دھندلکوں میں کھو گیا۔

'' شاہد۔ تم میرے بارے میں کچھ بھی تو نہیں جانتے۔ میں اور میرے گھر والے پچھلے ایک دو مہینوں سے ہی تو تمہارے پڑوس میں رہ رہے ہیں''

''او زرین! تم بھی نہ جانے کیا باتیں لے کر بیٹھ گئی ہو۔ تم ہی تو کہا کرتی ہو کہ ہم جنم جنم کے ساتھی ہیں۔ ہم صرف ایک دوسرے کے لئے بنے ہیں تو پھر یہ سب...''

''وہ تو ہے شاہد لیکن....''

''بس اب یہ پیار کے لمحے کیا ان ہی باتوں میں ہی کھو دو گی...؟''

اور سچ مچ شاہد آج بھی اُن پیار کی باتوں میں کھو گیا تھا لیکن جب چونک پڑا تو سامنے اُسی خط کی عبارت تھی۔

''شاہد صاحب... میں جانتی ہوں کہ آپ کے سامنے ایک شاندار مستقبل ہے اور میں آپ کی ایک خیر خواہ ہونے کے ناطے کبھی یہ نہیں چاہونگی کہ آپ کا شاندار مستقبل جھوٹے اور رنگین خوابوں کی دنیا میں کھو جائے۔ آپ کے سامنے ابھی بہت ساری ذمہ

داریاں ہیں۔ نہ جانے کتنے مریضوں کو آپ کی ضرورت ہوگی... میں کبھی نہیں چاہونگی کہ آپ اپنے فرض کی انجام دہی کے دوران کسی ایسی بات کو دل سے لگائے بیٹھیں جس کا نہ کوئی آغاز ہے اور نہ انجام''

زرّین... شاہد کے لبوں پر ایک سسکی سی اُبھری اور زرّین جو شاہد کے کاندھے پر سر رکھ کر کہیں دور کھوگئی تھی چونک پڑی

''زرّین.. میں سوچ رہا تھا۔ میری ٹریننگ کے ابھی تین چار مہینے باقی ہیں.. کہیں ان چار مہینوں میں تمہارے گھر والے...''

شاہد، خدا کے لئے ایسا مت کہو۔ زرّین جان دے گی لیکن کسی اور کی....''

شاہد کے کمرے میں دم گھٹتا ہوا ماحول تھا لیکن وعدوں کی وہ بلند بالا عمارت کاغذ کے ایک پرزے کی پھڑ پھڑاہٹ سے زمین بوس ہوگئی...وہ خط.....

''شاہد صاحب! زندگی میں بے شک ایسے لمحات بھی آتے ہیں جب انسان کی آنکھوں کے سامنے اُسکے اپنے خواب چکنا چور ہو جاتے ہیں۔ مجھے بہت افسوس ہو رہا ہے کہ میرے اس خط سے آپ کے دل کو ٹھیس پہنچے گی لیکن میں آپ کو زیادہ دیر تک اندھیرے میں رکھنا نہیں چاہتی...''

آگے کاغذ کورا تھا۔ بالکل کورا۔ مستقبل کی طرح جس کی ہر تصویر ابھی مصور کے برش سے نکل کر کینواس پہ آنے کے لئے مچل رہی تھی یا پھر شاید تخیل تصویر بننے سے پہلے ہی بکھر گیا ہو۔

شاہد سگریٹ پہ سگریٹ پھونکے جا رہا تھا اور رات دبے پاؤں سرک رہی تھی صبح نے جب کھڑکی کے راستے اپنی آمد کا اعلان کیا تو شاہد کے سامنے ایش

ٹرے میں سگریٹ بٹوں کا ایک انبار تھا اور اس وقت بھی وہ دھویں کے ایک مرغولے کا نظروں سے تعاقب کرتے ہوئے، نہ جانے کتنی دور پہنچ چکا تھا۔

''زرّین۔اب تمہیں پنکھ لگا کر میرے ساتھ آنا ہوگا۔ یہ دیکھو میری پوسٹنگ کا آرڈر''

''اوشاہد..'' زریں جیسے ہوا میں اُچھل پڑی۔ میں اسی ایک لمحے کی منتظر تھی۔

کہاں اپوینٹ ہوئے ہو'' زرین کا اشتیاق آسمان کی بلندیوں کو چھو رہا تھا

جمشید پور، تمہارے شہر میں ...اب تم کوئی بہانہ تو نہیں تراشو گی...'' شاہد پوچھنے کو تو شرارت بھرا سوال پوچھ چکا تھا لیکن زرین اُس کی بانہوں میں سمٹ کر نہ جانے کہاں کھو گئی تھی........

اس وقت شاہد بھی جمشید پور جانے والی ٹرین کی کھڑکی پر سر ٹکائے کہیں کھو گیا تھا اُس کی نگاہیں ابھی بھی منتظر تھیں۔ اُسے یقین تھا کہ ابھی زرینہ دوڑتی ہوئی ٹرین کے قریب آکر اُسے اس بات کی نوید سنائے گی کہ کل رات کا وہ خط...

ٹرین نے آخری سگنل دینی ہی شروع کی تھی کہ ایک چھوٹا سا لڑکا ایک کاغذ کا پرزہ لیکر اُس کے ڈبے کے قریب آتا ہوا دکھائی دیا اور جب ٹرین سرکنے لگی تو اُس لڑکے نے وہ پرزہ اُسکے ہاتھ میں تھما دیا...ٹرین سرک رہی تھی اور شاہد کی نظریں زرینہ کے آج کے خط پہ پھسلنے لگی تھیں۔

میری زندگی کے آخری ہمسفر !

خدا تمہارے مستقبل کو تابناک بنادے...جھوٹ بہرحال جھوٹ ہے اور جھوٹ سے بھلا کب تک اپنے آپ کو بہلایا جا سکتا ہے..نہ جانے وہ کون سی آواز تھی جس نے

مجھے تمہارے ساتھ گذارے ہوئے لمحوں کی وادیوں سے واپس بُلا کر ماضی کی اندھی کھائی میں دھکیل دیا.. میں نے پچھلے خط میں تمہارے اندر اپنے لئے ایک نفرت پیدا کرنے کی کوشش تو کی تھی لیکن میں جانتی ہوں کہ تم مجھے دل کی گہرائیوں سے چاہتے ہو۔

میرے شفیق اور ہمدرد ساتھی ۔ میں جانتی ہوں کہ تم نے مجھے محبّت کے اُس نازک احساس سے آشنا کیا ہے جس سے میں انجان تھی لیکن میں نہیں چاہتی کہ تم بھی کسی بات سے نا آشنا رہو۔ میں نے ہمیشہ تم کو اپنے قریب پایا ہے اور آج بھی جب میں اپنی تمام لغزشوں کے ساتھ اس دنیا کو چھوڑ کر جا رہی ہوں تب بھی تم میری ہر سانس میں بسے ہوئے ہو۔۔۔ بہت دکھ ہو رہا ہے تم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بچھڑنے کا۔۔ کاش ہم جنم جنم کے ہی....(اس کے آگے کچھ حروف آنسوؤں میں بہہ گئے تھے)

میرے مسیحا۔ میں نہیں چاہتی کہ اُس نرسنگ ہوم میں جہاں آپ اپنی نئی زندگی کا پہلا قدم رکھنے والے ہیں میرا منحوس سایہ بھی آپ کے ساتھ ہو کیونکہ اُسی ہسپتال کے کسی وارڈ میں میں نے ...میں نے اپنے ہی بچھڑے بھائی کی درندگی کے باعث ایک ناجائز.........''

ٹرین ایک خوفناک چیخ کے ساتھ پُل پہ دوڑنے لگی اور شاہد کے ہاتھوں میں زرینہ کا خط تھر تھر کانپنے لگا بالکل ویسے ہی جیسے شاہد کے ہونٹوں پر وہ لفظ کانپ رہے تھے ۔

''او زرین ۔ یہ تم نے کیا کر دیا۔ کاش میں تمہیں بتا سکتا کہ میں تمہارے بارے میں پہلے سے ہی سب کچھ جانتا تھا'' ☆☆

تنقید

تبصرے و تجزیے

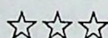
تنقیدی حروف تُند اور تلخ سہی
لیکن اِن تلخیوں میں بھی
مٹھاس کی چاشنی
تب محسوس ہوتی ہے
جب
صلح سے اِصلاح جنم لیتی ہے

سونامی !

افتخار امام صدیقی : مدیر ''شاعر''، ممبئی

''جہلم کا تیسرا کنارہ'' اور ''سلگتے چنار'' بہ وقت دو کتابیں۔ یہ آپ کا ہی حوصلہ ہے۔ ویسے میں نے محسوس کیا ہے کہ آپ کے باطن میں چنار ہی چنار بھرے ہوئے ہیں۔ ان میں کبھی روشنی بھر جاتی ہے اور کبھی یہ سرخ ہو جاتے ہیں۔

آپ کے اندر کوئی ''سونامی'' ہمہ وقت کھولتا رہتا ہے۔ ایک حساس تخلیق کار کے لئے یہ ضروری ہے۔



(۶؍ جولائی ۲۰۰۶ء)

سُلگتے چِنار

قمر سنبھلی (قلمکار: نقاد) نئی سڑک: دہلی

کشمیر جنت بے نظیر گذشتہ کئی برسوں سے جن حالات سے گزر رہا ہے اور وہاں کے رہنے والے جس قیامت کا منظر دیکھ رہے ہیں وہ میڈیا کے حوالے سے جگ ظاہر ہے۔ حساس لوگ بالخصوص جنہیں خدا نے شاعری کے وصف سے بھی نوازا ہے اس صورت حال سے کیسے خود کو الگ رکھ سکتے ہیں۔ یہ ناگفتہ مناظر وہاں کے صاحبانِ قلم کی تحریروں میں نمایاں ہو کر رہتے ہیں۔ زاہد مختار اسی سرزمین کے ایک حساس شاعر ہیں، حال ہی میں اُن کا شعری مجموعہ ''سلگتے چنار'' منظر عام پہ آیا ہے۔ اس مجموعے کے نام سے ہی شاعر کے جذبات جھلکتے محسوس ہوتے ہیں۔

زاہد مختار نے جو منظر کشی اپنی غزلوں اور کچھ نظموں میں کی ہے وہ اُن کے اندرونی جذبات کا بے ساختہ اظہار ہے۔ ان اشعار میں ہمیں فنی موشگافیوں سے قطع نظر ان کے دل میں چھپے درد کو ہی محسوس کرنا چاہئے جو سینے سے نکل کر صفحات پر نمایاں ہو گیا ہے۔ دیکھیں یہ اشعار:

چاک جب لفظوں کے سینے ہو گئے
اپنے آنسو بھی نگینے ہو گئے

خوشبوؤں کے شہر سے کچھ بھی نہ لے پائے گا وہ
آشیاں میرا جلا کر بس دھواں لے جائے گا

☆☆☆

پہاڑوں سے صدا اِک آ رہی ہے
کبوتر، چیل کالی کھا رہی ہے

☆☆☆

شاعر اِن حالات سے گزر کر بھی ان ظلم وستم کے اندھیروں میں خون دل کے چراغ روشن کرنے کی سعی کرتا ہے

تیر ظلمت پہ یوں چلائے تھے
کچھ دیئے خون کے جلائے تھے

اور ذرا یہ شدت احساس دیکھیں:

چاند جلتی رات سے گھبرائے گا
بادلوں کا دل پگھل سا جائے گا

☆☆☆

جو پھول بیچتا رہا اپنی دکان پر
چھالے پڑے ہوئے ہیں اُسی کی زبان پر

زاہدؔ مختار کی نظموں میں بھی یہی درد و کرب کا عالم ہے جن میں ''ایک دوپٹے کا ٹکڑا'' (گجرات کے نام) اور ''تنکے کی تقدیر'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مجروح جذبات اور حالات کی سنگینی کے برملا اظہار میں شاعر زبان و بیان کے روایتی آداب اور

فن کو ثانوی چیز سمجھتا ہے اس لئے مجموعے میں کئی ایسے مقامات بھی نظر آتے ہیں جہاں زبان بے بس اور موزونیت شعر لاچار اور شاعر کے دل کے ساتھ خود بھی زخم زخم دکھائی دیتی ہے۔ بہرحال شاعر کے جذبات کا یہ آئینہ جو ''سلگتے چنار'' کے معنی خیز نام سے منظر عام پہ آیا ہے، یقین ہے اردو حلقے میں سراہا جائے گا اور شاعر کی حوصلہ افزائی کی جائے گی

☆☆☆

(بشکریہ فلمی ستارے / باجی نومبر ۲۰۰۵)

المختار پبلی کیشنز کی مطبوعات

☆ ندامت (کشمیری شعری مجموعہ) ندیم کشتواڑی

☆ روح تہ ریاض (کشمیری شعری مجموعہ) اقبال شہید ☆ نے (محمد صیاف میر)

☆ علم عروض تہ بلاغت (غلام نبی ناظر) ☆ رموزات شیخ العالم (ڈاکٹر حسرت حسین)

☆ آب گل (حمید معصوم) ☆ ریہہ تہ رود (غلام نبی ناظر)

☆ سوز دروں (پیر غلام احمد وانی) ☆ گل بہار (گل سبزار)

☆ شلیچ پھلے (نعتیہ کلام) غلام نبی ناظر ☆ چھکتی کرنیں: (غلام نبی ناظر)

☆ جہلم کا تیسرا کنارا (زاہد مختار) ☆ سلگتے چنار (زاہد مختار)

☆ سلگتے جذبات (ڈاکٹر عبدالحی دیوا) ☆ علم (ویریندر پٹواری)

☆ خون جگر چوم (غلام محمد وگے رجیدہ) ☆ کلام (ایوب صابر)

☆ یادوں کی رہ گذر سے (تعمیل بشیر) ☆ بھیگی بھیگی پلکیں (زاہد مختار)

☆ کاشر محاورہ (غلام نبی ناظر) ☆ گلزار ارم (پیر غلام احمد وانی)

☆ اقبال شناسی، اُردو تنقید کے آئینے میں (ڈاکٹر نزیر احمد)

☆ ماہ پارہ گولابن منز (عبدالاحد واحد) تنبرِ ہلم (زاہد مختار) ....

جہلم کا تیسرا کنارہ....

☆ ویریندر پٹواری : ڈیلکس اپارٹمنٹ، نوئیڈا، دہلی

ریاست جموں کشمیر میں اردو سرکاری زبان ہے مگر.......؟ وہ کہانی پھر سہی

ایک زمانہ وہ بھی تھا جب بیسویں صدی جیسے بین الاقوامی جریدے میں مرحوم کرشن چندر، مرحوم راجندر سنگھ بیدی، مرحوم خواجہ احمد عباس جیسے افسانہ نگاروں کے ساتھ ہماری ریاست کے مصنفین مثلاً مرحوم ٹھاکر پونچھی، مرحوم موہن یاور، جناب نور شاہ، جناب پشکر ناتھ وغیرہ باقاعدگی سے نظر آیا کرتے تھے لیکن بعد میں نہ جانے کیا ہوا، کیوں ہوا اور کیسے ہوا کہ ریاست میں اردو کی ہری گھاس دیکھتے ہی دیکھتے زرد ہو کر اپنا وجود کھو بیٹھی ! پھر ایک نیا سلسلہ شروع ہوا، جانے مانے ادبا بھی ملک بلکہ برصغیر کے قارئین تک اپنے احساسات اور خیالات کو پہنچانے والے جرائد سے ناطہ توڑ کر اپنے مجموعے شایع کرنے کو ہی ترجیح دینے لگے ہیں۔ ان میں چند گنے چنے لوگوں کو انعامات بھی ملے مگر وہ عام قارئین تک پہنچ نہیں پائے اسکے برعکس جنہوں نے جرائد میں بھی لکھنا جاری رکھا وہ قارئین کے دل و دماغ میں رہتے ہیں، آج بھی میں جب کسی نئے پرانے ادبی یا نیم ادبی بلکہ اخباروں میں جناب جوگیندر پال، جناب نور شاہ، جناب گلزار یا جناب آنند لہر کی کہانی دیکھ لیتا ہوں تو بطور ایک مداح کے پڑھ لیتا ہوں۔

زاہد مختار کشمیر کے ایک اچھے افسانہ نگار ہیں اور اپنے اولین افسانوں کے مجموعے کی اشاعت سے پہلے انہوں نے ملک کے بیشتر ادبی یا نیم ادبی جرائد میں اپنی بے حد خوبصورت کہانیاں لکھ کے اپنی پہچان بنالی ہے یعنی وہ جانے مانے کہانی کار ہیں جن کا ایک مداح میں بھی ہوں۔

''جہلم کا تیسرا کنارا''۔۔اس مجموعے میں زاہد صاحب کی ۲۵ کہانیاں شامل ہیں اور ان تمام کہانیوں میں مصنف کا ایک مخصوص زاویہ نگاہ نظر آرہا ہے۔اپنے گردوپیش کا باریکی بینی سے مشاہدہ کر کے انہوں نے اپنے احساسات کے ساتھ اپنے خیالات کا بھی اظہار کیا ہے اور چند واقعات کو کہانیوں کا روپ دیا ہے۔

کہانی کیا ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جسے میں کچھ کچھ سمجھ پایا ہوں اور کچھ کچھ خود کو سمجھانے کی کوشش کررہا ہوں۔سڑک پر ایک خون سے لت پت اور گولیوں سے چھلنی لاش دیکھ کر کوئی خوشی کا اظہار کرتا ہے اور کوئی رنج وغم کا مظاہرہ کرتا ہے۔یہ ایک خبر ہے، گو ایک لہر ہے جس کا تعاقب دوسری لہر کرتی ہے۔آج کی خبر گزرے کل کی خبر کو دھکیل کر قارئین، سامعین اور ناظرین کی توجہ کی مرکز بن کر کسی کی آہ یا واہ کا موضوع بن جاتی ہے مگر ایک تخلیق کار لاش کو دیکھ کر جو ریکشن Reaction دیتا ہے وہاں سے کہانی کی شروعات ہوتی ہے۔گویا تخلیقی ذہن میں یعنی زرخیز زمین میں ایک کہانی کا بیج پڑ جاتا ہے، یعنی ایک عورت کا حمل ٹھہر جاتا ہے، بچہ پیدا ہو جاتا ہے اور کہانی جنم لیتی ہے جس کو قلم سے قرطاس پر برش سے کینواس پر یا پھر کیمرے سے سلولائیڈ پر اُتارا جاتا ہے، چونکہ زاہد صاحب ایک قلم کار بھی ہیں، ایک چتر کار بھی ہیں اور ایک فلم کار بھی ہیں اسلئے اُنکی تمام کہانیوں میں کہیں جملوں کا کولاج ہے، کہیں رنگوں کے معنی خیز نوڈز Nodes

ہیں ۔ چند کہانیاں کیمرے کیلئے صدائیں دے رہی ہیں اور چند کہانیاں ایک فلم بنانے کے ابتدائی مرحلوں کی عکاسی کر رہی ہے یعنی Synopsis with dailouge indication خیر کہانی تو کہانی ہی رہتی ہے اور جب کہانی میں قلم کار، فلم کار اور چتر کار ایک ساتھ نظر آجائیں تو کہانی اداکار زاہد کی طرح بول پڑتی ہے اور بولتے ہوئے مہک اُٹھتی ہے۔

زاہد صاحب کو اردو زبان پر عبور حاصل ہے، اُنکا اسلوب منفرد ہے، اپنے خیالات، احساسات یا محسوسات کو ظاہر کرنے کا اپنا ایک انداز ہے۔ کچھ کہانیوں میں تمہید باندھ کر مطلب کی بات کہی گئی ہے مگر زبان کی لطافت اور بیان میں روانی قاری کی دلچسپی کو قائم رکھنے میں موثر ثابت ہوئی ہے۔ ساری کہانیاں اچھی ہیں مگر بہت ہی اچھی کہانیوں میں ''لمحے کا سفر'' ''باسی روٹی'' ''جہلم کا تیسرا کنارہ'' ''سورج کا پہلا اندھیرا'' اور ''پل صراط'' ہیں۔

آج کل کے دور میں سیاست، جہالت کی حوصلہ افزائی کر رہی ہے اور انسانیت کو روند کر کسی ڈراونی حکایت کو حقیقت کی شکل دے کر اپنے انجام سے باخبر رکھنے کیلئے کبھی سبز باغ دکھاتی رہتی ہے اور کبھی ٹینکوں Tank اور کبھی بل ڈوزر Bulldozer کی پیش قدمی دکھا کر۔ ایسے حالت میں اجڑے، اُکھڑے خاندان کا مسیحا، ناخدا بن کر اپنی کشتی کو بچائے تو کیسے؟ جب دریا کے دونوں کناروں پر کھڑے اہل ساحل اُسکو اپنے قریب آنے نہیں دیتے اور پھر دریا کا تیسرا کنارہ ہوتا نہیں۔ حکایت میں ناخدا کی دعا کے بعد دریا کی سطح پر ایک فرشتہ نمودار ہوتا اور وہی ایک جزیرہ بن کر کشتی کا کنارہ بن جاتا مگر حقیقتاً ایسا ہوتا نہیں ہے۔ دریا کا کنارہ ایک گرداب ہے جو کشتی کو نگل جاتا ہے۔ ایسا ہی

تاثر زاہد صاحب نے اپنی کہانی ''جہلم کا تیسرا کنارا'' کہانی میں دیا ہے۔ سونہ جو کا ہاوس بوٹ قہر خدا یعنی سیلاب کا شکار ہو جاتا ہے تو وہ جہلم کے کنارے پر اپنا آشیانہ بنا دیتا ہے مگر وہ قہر آدم کا شکار ہو کر ایک کاٹھ کے ٹکڑے کی طرح بے بس ہو کر دریا کی تیز روانی کے ساتھ بہہ کر کنارے کو دیکھتا رہتا ہے جہاں سے وہ اکھڑ گیا تھا۔

دیکھا جائے تو پچھلے تیراں (۱۳) برسوں میں دنیا والے کشمیر کی زمین کے بارے میں غور وفکر کرتے رہتے ہیں، کشمیریوں کے دکھ درد کے بارے میں کوئی سوچتا بھی نہیں۔ کشمیر سے ہجرت کرنے والوں کا وقتاً فوقتاً ذکر ہوتا رہتا ہے مگر کشمیر میں رہنے والے لوگوں کو آج بھی کن کن جسمانی و ذہنی اذیتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ زاہد صاحب نے اپنی کہانیوں بعنوان ''پل صراط'' اور سورج کا پہلا اندھیرا'' میں بیان کیا ہے۔ ''باسی روٹی'' ایک ایسی سماجی کہانی ہے جس کو سیاسی زاویے سے دیکھا جائے تو زاہد صاحب نے سمندر کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ مجموعے میں شامل تمام کہانیاں دلچسپ ہیں اور ایک آئینے کی طرح سچ بولتی ہیں۔ میں جان بوجھ کر کہانیوں کے خلاصے نہیں دے رہا ہوں کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ قارئین ہر کہانی کو پہلی سطر سے آخری سطر تک پڑھ کر سطور کے درمیان چھپے ایک ذی ہوش کہانی کار کے خیالات کو سمجھنے کی سعی کرے۔ جملوں کی بناوٹ میں زاہد صاحب ماہر ہیں، شاید اسلئے کہ جو وہ بحثیت ایک فلم کار شاٹ ڈسٹربیوشن اور شاٹ کمپوزنگ کرتے رہتے ہیں وہی تکنیک وہ کہانیاں لکھنے میں استعمال کرنا لازمی سمجھ رہے ہوں، لیکن ایسا کرتے وقت کبھی قلم کار، فلم کار پر اور اکثر فلم کار، قلم کار پر حاوی ہو جاتا ہے۔ کتاب میں شامل کہانی ''آنگن'' کا کینواس پھیلا کر ایک ناول لکھا جا سکتا ہے۔ زاہد ایک بہت اچھے شاعر ہیں اور ثبوت اس کتاب کے صفحہ نمبر ۸۴ پر چھپی نظم ہے۔

ابھی ہے سلگتے چناروں کی برسی

ابھی ننھی چھاؤں کا چہلم ہے باقی

ابھی سونا سونا یہ میرا چمن ہے

ابھی اپنے جہلم کا عریاں بدن ہے

کتاب کا ٹائٹل خوبصورت ہے اور ''برق تخیّل'' میں زاہد صاحب نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ایک کنوکشن Conviction کے ساتھ وہ ایک فلسفی کی طرح سوچتے ہیں اور ایک پریکٹیکل اپروچ Practical approach کے ساتھ اپنا کام کرتے ہیں، یہ بہت بڑی بات ہے۔

یہ جانتے ہوئے کہ آج کل اردو ادب کو فروغ دینے والے بیشتر حضرات کتابیں پڑھنے کی بجائے وہ پڑھتے ہیں جو کسی نے کتاب کے بارے میں لکھا ہے، میں قارئین سے درخواست کرنا چاہوں گا کہ وہ زاہد مختار کی کہانیاں پڑھ کر اُنکے بارے میں اپنی رائے قائم کریں

☆☆☆

(۱۰/۱اکتوبر۲۰۰۴ء)

حرکت اور روشنی کا احساس

نورؔ شاہ: قلمکار: راول پورہ سرینگر

''سلگتے چنار'' شعری تخلیق ہے۔ دراصل یہ سوچنے والے ذہن کی پکار ہے ''سلگتے چنار'' پڑھ کر مجھے احساس ہوا کہ جموں کشمیر کی سرسبز فضاؤں میں بڑی تیزی کے ساتھ ایک اور اہم شاعر اُبھر آیا ہے۔ زاہد کی غزلوں میں زبان کی نزاکتوں کا شعور ہے، فصاحت اور بلاغت کا دخل ہے، زاہد مختار کی نظموں کا کینواس بھی وسیع ہے اور اظہار میں جذب واثر کی شدّت ہے۔ ''یادوں کے فانوس'' کے عنوان سے مصنف نے جو آپ بیتی لکھی ہے وہ بے حد دلچسپ ہے۔ اس کے ہر جملے میں زاہدؔ کے دل کی آواز سنائی دیتی ہے اپنوں اور غیروں سے زاہد کی شفقت اور علم وادب سے اُس کے لگاؤ کی ایک بھرپور جھلک ملتی ہے۔ اس آپ بیتی میں زاہدؔ نے بچپن کی معصومیت اور لڑکپن اور جوانی کے ولولوں کی عکاسی کی ہے۔ دریاؤں اور پہاڑوں سے اپنا راستہ حاصل کرنے کے لئے اُس نے اپنی زندگی میں جو جدوجہد کی ہے اس جدوجہد کے نتیجے میں اُس کی شاعری کا رنگ نکھر آیا ہے

یہاں ہر شخص کا آئینہ میں ہوں میرے ہاتھوں میں نشتر ہے قلم ہے

زاہدؔ کے افسانے مختلف جرائد میں پڑھتا رہتا ہوں۔ مصنف کا تازہ افسانوی

مجموعہ ''جہلم کا تیسرا کنارہ'' میرے سامنے ہے۔ بحثیت افسانہ نگار زاؔہد مختار اپنا ایک مقام بنا چکے ہیں۔ افسانوی دنیا میں اُن کا ایک نام ہے۔ اُن کے افسانوں کو پڑھ کر حرکت اور روشنی کا احساس ہوتا ہے۔ آج ہم جس تاریک ماحول اور مایوس کن حالات سے گزر رہے ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ یہ ماحول اور یہ مایوسی زاؔہد کے کئی افسانوں میں بھی ملتی ہے لیکن مایوسی اور تاریکی کی کوکھ سے روشن زندگی کا حسن بھی نظر آتا ہے۔ زاؔہد کی تحریروں میں ایک اعتماد ہے۔ عزم ہے، سنجیدگی اور متانت ہے۔

دونوں کتابوں کا گٹ اپ شاندار ہے اسکے لئے عادل مختار کو میری جانب سے مبارکباد۔



(۱۷ فروری ۲۰۰۶ء)

زاہد مختار: ایک شاعر، ایک کہانی کار

سید رسول پونپر؛ محقق، نقاد، شاعر، بجبہاڑہ: کشمیر

۱۵ جنوری ۱۹۵۷ء میں میری ہمسائیگی قصبہ اسلام آباد (اننت ناگ) کے محلّہ چینی چوک میں حاجی ثناء اللہ صاحب کے گھر جنمے، سیماب طبعیت کے مالک باصلاحیت نوجوان تخلیق کار زاہد مختار کا نام نامی میں نے بھی اور لوگوں کی طرح بہت سنا تھا لیکن قریب سے جاننے کا موقع نہیں ملا تھا۔ کشمیری اور اردو کے نمائندہ غزل گو نقاد، محقق اور مترجم غلام نبی ناظر کی زبانی اُسکی گونا گوں صلاحیتوں کے بارے میں سن کر میرے دل میں اُسے دیکھنے اور سننے کے لئے اشتیاق بڑھا۔ پچھلے ڈیڑھ ایک سال سے میں کچھ ادبی اور کچھ نجی محفلوں میں اس خوبرو، چنچل، سیماب یا فنکار و تخلیق کار کو قریب سے دیکھنے اور جاننے کا موقع ملا پھر بھی میں دعویٰ تو نہیں کر سکتا کہ مجھے اُسکی شخصیت سے گہری شناسائی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس خاک کے پتلے انسان کو ایسے پر اسرار طریقہ سے گڑھ لیا ہے کہ عقل ہی دھنگ رہ جاتی ہے۔

زاہد مختار کی ذات کے خدوخال کچھ کچھ اُنکی شاعری وافسانہ نگاری اور بہت حد تک اُسکے اردو شعری مجموعے ''سلگتے چنار'' کے ابتدائی صفحات میں ''یادوں کے فانوس'' کے تحت شامل کی گئی اُس کی ''آتم کتھا'' سے سمیٹے جا سکتے ہیں جسمیں اُس نے نہ جانے کیوں رطب ویابس سب کچھ ہمارے سامنے جمع کر کے رکھ چھوڑا ہے۔ زاہد مختار نے کچھ

نجی حوادث وواقعات کواس طرح بیان کیا ہے کہ قاری خوامخواہ شکوک وشبہات کا شکار ہوکر بے جا اُلجھنوں کا شکار ہوتا ہے یا تو بات کھل کر کرنی تھی یا تو بالکل ہی کئی امور کو چھونا ہی نہیں چاہئے تھا۔ مثال کے طور پر چینی چوک سے انتقال مکان کی باتیں۔ زندگی انسان کو خاصکر تخلیق کار کو حوادث وتجربات کی شکل میں بہت کچھ دیتی ہے لیکن سب کچھ ضبط تحریر یا تخلیق کی صورت میں لوٹانے یا لانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر یہ کہنا کہ جو جتنا بارسوخ ہو وہی بڑا ادیب ہوتا ہے۔ میرے خیال میں زاؔہد مختار کی ''یادوں کے فانوس سے یہ دوتین سطریں کسی وضاحت کی محتاج نہیں؛

''.........اب، یہاں ادیب رہتے ہیں، قلم کے جادوگر رہتے ہیں، خوبصورت شاعر رہتے ہیں، غضب کے افسانہ نگار رہتے ہیں۔ اعلیٰ پایہ کے ڈرامہ نگار اور صحافی رہتے ہیں لیکن صاحب دل کہاں کھو گئے کوئی علم نہیں۔ واردات روز شب کو، سانحوں اور حادثوں کو، ظلمتوں اور ضیا پاشیوں کو سب نے متاع دکان بنا دیا ہے۔ ان میں کوئی کسی کی خبر نہیں رکھتا، کوئی یادوں کا گلشن نہیں مہکاتا، کوئی خلوص کی آبیاری نہیں کرتا۔ نہ کوئی کسی سے بنا مطلب کے ملتا ہے اور نہ ہی اب کوئی کسی کو خط لکھتا ہے.....سب اچھے برے، ادنیٰ اعلیٰ چھوٹے بڑے ادیب ہیں صرف ادیب جن میں اکثر دوردرشن کے منڈی ہاوس سے لیکر ریڈیو کشمیر کے ڈیوٹی روم تک، کلچرل اکادمی سے لیکر ساہیتہ اکادمی تک جبہ سائی کو ہی اپنا فرض سمجھتے ہیں.......''

اتنے اہم اور حتمی فیصلے ادب وشاعری کے میدان میں نہیں دئے جاتے کیونکہ اداروں سے ادیب وقلمکار نہیں ہوتے بلکہ ادارے ہی ان کے مرہون منت ہوتے ہیں اور پھر جبکہ تخلیق کاروں کی ودیعت صلاحتیں اللہ ہی کی دین ہیں۔

این سعادت بزور بازو نیست، تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

پھر شکوہ وشکایات بھی یہاں زیب نہیں دیتیں اس لئے کہ غالب بھی بہت پہلے کہہ چکے ہیں نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا نہ سہی میرے اشعار میں معنی نہ سہی

زاہد مختار اوائل عمر میں ہی مقامی طور ادبی، ثقافتی اور صحافتی تحریک سے وابستہ رہے جو مجھ ناچیز کے مشاہدے کے مطابق اکثر و بیشتر موقعہ پرستی ہی کی شکار ہوئی۔ زاہد مختار کو صحافت وثقافت سے جڑے رہنے کی بنا پر علم ہے کہ مقامی طور صحافتی سرگرمیاں کتنی معیاری اور محدود ہیں "یادوں کے فانوس" اجمالاً ہماری مقامی صحافتی، ثقافتی اور ادبی تحریک کے ایک باب کو کھولتی ہے۔

۱۹۸۴ء سے زاہد مختار دور درشن کے لئے متعدد سیریلز لکھ چکے ہیں جن میں رسول میر، حبہ خاتون، صمد میر، ہی مال ناگرائے اور سلگتے چنار قابل ذکر ہیں وہ ایک کامیاب پیش کار بھی ہیں۔

نوجوانی میں نوکری چاکری کی پابندیوں سے بیزار مختار اب زندگی کی ناگزیر پابندیاں قبول کر کے مزے سے جی رہے ہیں۔ تمہید ذرا مختصر ہی ہونی چاہئے تھی لیکن کیا کیا جائے "یادوں کے فانوس" اُکساتے رہے اور مجھے اصلی مدعا کی طرف آنے میں تھوڑا توقف ہوا جس کے لئے میں معذرت خواہ ہوں۔

زاہد مختار کا شعری مجموعہ "سلگتے چنار" ۱۰۴ صفحات پر پھیلا ہوا ہے جسکی شروعات حسب روایت جمیل حمد باری تعالیٰ اور ہدیۂ نعت ہی سے یوں ہوتی ہے۔

جو تاریک شب کو سویرا بنا دے
شرف کس نے بخشا ہے ایسا اذاں کو

جب ریت کے ذروں کی اُس خوشبو کا ذکر ہو

ہم گنبد خضرا کا وہ گلزار لکھیں گے

اسکے بعد بیس غزلیں اور اُتنی ہی نظمیں دی گئی ہیں ''یادوں کے فانوس'' جسکا ذکر پہلے ہی ہو چکا ہے اس مختصر سے مجموعے کے چونتیس صفحات پر پھیلے ہوئے ہے۔غزل ہو یا نظم یا نثر انکی فنی ہیئتی اور تخلیقی روایات کے منبع کو کوئی جھٹلا نہیں سکتا اس لئے اگر زاہد مختار بھی روائت کا دامن تھام کر نظم ونثر کی دلہن سجا رہے ہیں تو یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ ظاہر ہے کہ چنار کو کشمیر سے گہری نسبت ہے بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ چنار ہمارا یعنی کشمیر کا قومی درخت ہے تو بے محل نہ ہوگا اس لئے زاہد مختار کی غزلوں اور نظموں میں غم جاناں، غم جہاں، عصری کرب وآگہی، جدید حس آگہی، احساس زیاں اور ابدی انسانی قدروں کی شکست وریخت سب ڈھل کر پیکر حزن وملال اور آہ وبکا بن جائیں اور کشمیر کی ترجمان بھی تو یہ ایک فطری امر ہے

لہو کا اک سمندر پی چکا ہوں؛ میں ہر اک زخم دل کا سی چکا ہوں



آو دو پل زندگی سے پیار کی باتیں کریں، پھر کسی سرحد کسی دیوار کی باتیں کریں



قلم تختی سیاہی حرف کاغذ، میرے اندر کا بچپن سو گیا ہے



آوازوں کی قبروں پر ہے خاموشی کی چیخ وپکار

سارے مکیں ہیں جیسے بے گھر اپنا شہر پرایا سا

جس مکاں میں سنگ باراں سے پناہ لینے گیا
اُس مکاں کی گرتی دیواروں سے وحشت ہوگئی
ایک سنگ در سجا کر وہ مکاں لے جائے گا
ایک ایسا شخص ہوگا کارواں لے جائے گا



جسے بچپن میں ہم بھی چھیڑتے تھے　　وہ پگلی آج بھی کچھ گا رہی ہے



آنکھ کے آنسو میں منظر آ گیا　　سر کے اوپر پھر سمندر آ گیا



روٹھی ہوئی ہوائیں ہیں بارش نہ آئے گی
چنگاریوں کا شہر ہے دامن بچایئے



اب کے ہے انتظار خاموشی　،　بس سلگتے چنار خاموشی

اسی طرح ''جہلم'' جو ''ویتھ'' کا پرایا دیا ہوا نام ہے بھی زاہد مختار کے یہاں کشمیری تہذیب کی نہ صرف علامت بن کر اُبھرا ہے بلکہ ترسیل کا موثر ذریعہ بھی غزل اور نظم دونوں میں جسکی مختلف جہتیں ہوسکتی ہیں۔

قلب میں گر حوصلہ ہے جا کے جہلم روک دو
پھر کسی سرحد کسی تلوار کی باتیں کریں
پیاس کا پنچھی جو لوٹے گا کبھی　　اپنا جہلم دیکھ کے شرمائے گا

زاہد کے گاؤں کا جہلم اب بھی پانی پانی ہے،

ہر قصے کی زندہ کہانی جب بہہ جائے تم آنا

جیسا کہ میں پہلے بھی اشارہ کر چکا ہوں کہ غم روزگار کے پہلو بہ پہلو زاہد مختار غم دلدار بھی سینے سے لگائے بیٹھے ہیں۔غزلوں کے علاوہ اُنکی نظمیں بغیر کسی بے جا ابہام کے اپنے جذبات واحساسات کو سادگی۔سلاست۔شستہ گی اور برجستہ گی سے بیان کرتے ہیں۔وہ موجودہ انسانی سماج کو ابدی انسانی قدروں کی پامالی پر متانت اور سنجیدگی سے جھنجھوڑتے ہیں کیونکہ نفسا نفسی، بہمیت، حمیت ومروت کا فقدان اُس سے دیکھا نہیں جاتا۔

ابھی کہاں وہ گنی ہیں ساری
عریاں عریاں لاشیں میں نے
کہ دو بلیوں کے بیچ میں یہ کیوں
اک روٹی پہ جھگڑا کھڑا ہے
روٹی روٹی کیسی روٹی
جس روٹی پہ خون لگا ہے ....(ایک دوپٹے کا ٹکڑا)



اس دن جمہوری دلہن کی
سالگرہ تھی دھوم بڑی تھی
قہر الٰہی کے خنجر نے
چاک کیا تھا ارض وسماں کو

ہر سو بس اک شور بپا تھا

آ و یہاں انسان مرا ہے

اب کے بھی اک شور مچا ہے

''کس گھر میں اب کون بچا ہے''

نظر و نگاہ میں اب دوری ہے

اب اک ناری اک نوری ہے

سنگھاسن کی مجبوری ہے

اب یہ موت بھی جمہوری ہے ....(گجرات کے نام)

☆☆

......کون ہے جو کھا کے تیروں کا یہ وار

جی رہا ہے مسکرا کے بار بار

کون ہے جو کہہ رہا ہے الاماں

میں کہ میری قوم کا اک نوجواں............ (.الاماں)

آ ؤ نس نس میں میری تم بھی سما کر دیکھو

آ و سب پردے زمانے کے جلا کر دیکھو

تم نے جینے کے جتانے کے کئی کھیل کئے

آ و زاہد کی طرح خود کو لٹا کر دیکھو

اور یہ بھی کہ ''خاموشی قبرستان کی کتنی بھلی لگتی ہے .....(خاموشی)

یہ مجموعہ اپنی بیٹی حنا اور بیٹے'' عادل کے نام معنون کرنے کے بعد زاہد مختار

ایک اور کتابچہ ''اجنبی شہر کے اجنبی راستے'' کے نام سے ناظرین کی خدمت میں حاضر ہو چکے ہیں۔ یہ کتابچہ وہ اپنی شریک حیات محترمہ روبینہ شاہین کے نام منسوب کرتے ہوئے امید ظاہر کرتے ہیں کہ اُس کی یہ کوشش محبت کی قندیلیں ضرور روشن کرے گی کیونکہ وہ خود شعروادب کی افادیت ومقصدیت کے واضح طور قائل ہیں

یہ خوبصورت کتابچہ بیس صفحات پر پھیلا ہے اور یہ ذراسی طویل نظم کل ایک سو چار اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کا انتخاب الفاظ۔ اسکی سلاست، سادگی اور روانی الغرض اسلوب وانداز دلکش ہے۔ اسکی زبان عالمانہ اور ماہرانہ فنی رچاو کی غماز ہے اسکی ایک اور خوبی اسکی چھوٹی چھوٹی بحر ہے جو اردو کی منفرد آوازوں کی تخلیقی تقلید ہے

اجنبی راستے، اجنبی کارواں
اجنبی ہر قدم اجنبی ہر نشاں
اجنبی منزلوں کی طلب اجنبی
اجنبی نقش پا اجنبی داستاں

☆☆

اجنبی خضر ہے۔ اجنبی شہر ہے
اجنبی شام ہے، اجنبی سحر ہے
اجنبی ہر گلی کا ہر اک موڑ بھی
اجنبی دہشتیں اجنبی قہر ہے

☆☆

اجنبی رفعتیں، اجنبی ذوق ہے
اجنبی وسعتیں اجنبی طوق ہے
اجنبی سے ارادوں کی منزل کہاں
اجنبی اپنے مختار کا شوق ہے

دیکھا جائے تو کائنات کا ذرہ ذرہ آپس میں ہم آہنگ ہے اور بادی النظر میں اجنبیت کا احساس بھی فطری ہم آہنگی کا ایک حصہ ہے جو دھیرے دھیرے قربت والفت میں بدل جاتا ہے۔ یہاں اجنبیت، زندگی کا بے انت، بے نام اور ظاہراً بے معنی سفر کے ذہنی پیکر کی صورت اُبھری ہے۔

''جہلم کا تیسرا کنارہ'' زاہد مختار کی اٹھائیس مختصر کہانیوں کا مجموعہ ہے جس کا انتساب وہ بجا طور اپنے والد محترم کے نام یوں کرتے ہیں

''اپنے والد محترم مرحوم حاجی ثناء اللہ کے علمی اور دینی اُنس کے نام جس نے مجھے طالب علم بنا دیا''

اس کے بعد صفحہ نمبر ۷ سے ۱۹ تک ''برق تخیل'' کے تحت اُن ان گنت سولات کو چھیڑا گیا ہے جن کے جوابات کی جستجو میں بنی نوع انسان آج بھی سرگرداں ہے۔ بہتر یہی ہوتا کہ کچھ امور کا ذکر اگر نا ہی کیا جاتا تو اچھا ہوتا۔ سب سے بہتر یہی ہوتا کہ برق تخیل کے بجائے زاہد مختار اپنی افسانہ نگاری کے حوالے سے کشمیر میں اردو کہانی کے نشو ونما اور ارتقاء کی بات کرتے۔ برق تخیل میں کوئی نئی بات نہیں ہے اور نا ہی یہ دیباچے کا نعم البدل ہوسکتا ہے۔

اور پھر میری کہانی کا افسانہ۔ صفحہ نمبر بیس وقف ہے۔ ''ابتدا اور انتہا'' دو الگ

الگ عنوانوں میں بٹا ہوا ہے جس میں وہ سلگتے چنار کی آپ بیتی سے پھر اپنے تاثرات کو یوں دہرا رہے ہیں

'......رقابت ہے تو حسد آمدن کی نہ کہ رشک فن کی جس کی جتنی پہنچ ہے وہ اُتنا بڑا ادیب ہے، نئی پود کے تئیں سرد مہری آنے والے کل کے لئے سم قاتل ثابت ہو رہی ہے ''من ترا حاجی بگویید تو مرا حاجی بگو' کی ایک اندھی دوڑ کا تماشا چل رہا ہے اور میں خاموش تماشائی بننا نہیں چاہتا.........''

حسد و رشک کی بات سمجھ میں آتی ہے لیکن ''پہنچ'' اور ''بڑے ادیب'' کا مبہم کلیہ بالکل ناقابل فہم ہے ۔ فطری طور خلاق اور باصلاحیت تخلیق کار کی راہ میں کوئی بھی رکاوٹ کسی بھی صورت میں حائل نہیں ہو سکتی۔ میرے خیال میں یہاں اتنا ہی اشارہ کافی ہے کہ بحث کو طول نہ دے کر اصل مقصد سے ہٹنا نہیں چاہتا کیونکہ مجھے کہانی کے اس مجموعے کے بارے میں مختصراً ہی بات کرنی ہے۔

صفحہ اکیس سے صفحہ ۱۲۶ (اختتام) تک ''سورج کا پہلا اندھیرا، لمحے کا سفر، باسی روٹی ۔، پل صراط، پہلا چہرا، کسوٹی، سودا۔ تلخیاں، فرار، فرق، بند دروازہ، ایک ادھوری کہانی، خلیج، سحر ہونے تک، آخری صفحہ، وفا اور ساز تھم گیا، نجات، کتبہ، آنگن، اپنے حصے کی سحر، شرپسند، جہلم کا تیسرا کنارہ، واپسی، ایک کہانی تیرے بغیر، سکوت''... جیسے عنوانات کی کہانیاں اور آخر میں مصور ایس طارق کے ہاتھوں زاہد مختار کی کھنچی لکیروں کی خوبصورت تصویر۔

زاہد مختار کے سامنے فنی روایات کی صورت میں اردو کہانی کے علاوہ کشمیری نژاد معروف کہانی کاروں پریم ناتھ پردیسی، حامدی کاشمیری، پریم ناتھ دھر، علی محمد لون، اختر

محی الدین، غلام رسول سنتوش، ۔امیش کول، بنسی نردوش، تیج بہادر بھان، نور شاہ، ۔
محمد زماں آزردہ، عبدالغنی شیخ، برج پریمی، کلدیپ رعنا، عمر مجید، جان محمد آزاد، ویریندر
پٹواری و دیگر تخلیق کاروں کی ایک کہکشاں ہے۔جنہوں نے روایتی کہانی کے ساتھ ساتھ
نئی مجرد کہانی سے بھی اپنی تخلیق کی قندیلیں روشن کی ہیں ۔زاہد مختار کی کہانیاں جدید مجرد
کہانیوں کے زمرے میں نہیں آتیں اور نا ہی انہیں روایتی اردو افسانے کا نام دیا جا سکتا
ہے، چونکہ زاہد پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا دونوں سے منسلک ہیں اس لئے انہوں نے
جدید تکنیک کے سہارے بھی موجودہ انسان کے مختلف النوع، المیے اور احساس کو زبان
دی ہے جسکی کوئی انتہا نہیں اور جس سے انسانیت سرنگوں ہے۔(سورج کا پہلا اندھیرا، سحر
ہونے تک): کشمیری سیاست کی قلا بازیاں، گرگٹ کے بدلتے رنگ اور عام آدمی کی
انسانی رواداری اور کشمیری شناخت کی بدلتی اجنبی صورتیں (لمحے کا سفر) تاجرانہ سماجی
رشتے جو نفسا نفسی کے شکار ہیں اور مروت و محبت سے عاری (باسی روٹی) صبر آزما حوصلہ
شکن، نازک سیاسی غیر یقینیت اور کریک ڈاون کلچر (پل صراط اور پہلا چہرا)۔ ملا جلا
انسانی ہمدردی کا موہوم اور مبہم جذبہ (سودا) سچائی داستان سے بھی زیادہ کڑوی (تلخیاں
فرار، فرق، بند دروازہ، ادھوری کہانی۔ خلیج) زندگی کا انجانا سپنا۔ نا تمام المیہ، بے معنی سا
انجام (آخری صفحہ)۔ایک انجانی لاشعور میں دبی کسک (اور ساز تھم گیا) ایک اعتماد، ایک
اتفاق، ایک خطا اور ایک عظیم منفرد شناخت کا مسلسل زیاں اور موت کا لامنتہای رقص
(نجات، کتبہ، اپنے حصے کی سحر۔ شر پسند) مقدر کی ستم ظریفی (آنگن) عوام سیاسی شطرنج
کے مہرے (جہلم کا تیسرا کنارہ) انسانی جبلت و جذبات کی ناگزیریت، انسانی جذباتی
روابط کے اُبھرتے مٹتے رنگ جن سے زندگی عبارت ہے (واپسی، ایک کہانی تیرے

بغیر) سے صاف ظاہر ہے کہ زاہد مختار کسی بندھے ٹکے نظریے کا قائل نہ ہوتے ہوئے بھی انسانی محبت ومروت کا پاسدار ہے۔ اُسے ابھی زبان وبیان کے ایجاز واعجاز سے بھرپور اور ماہرانہ آگہی پانے میں تھوڑا وقت لگے گا تب جا کر اُسے ایک مشاق کہانی کار کا رتبہ ملے گا۔ اُسے عام زندگی کے قریب جا کر مشاہدہ کو اور زیادہ گہرا، والہانہ اور مشفقانہ کر کے زیادہ سے زیادہ رنگوں کو اپنے فن میں دلکش انداز میں سمونا اور لوٹانا ہے چونکہ اردو زبان ہماری کسی زبان ہے کوئی مادری زبان نہیں اس لئے اس ضمن میں اور زیادہ توجہ کی ضرورت ہے۔

توقع ہے کہ ریاست اور بیرون ریاست کے اردو حلقے زاہد مختار جیسے جواں سال باصلاحیت شاعر، کہانی کار، ناٹک کار اور پیش کار کی شعری اور نثری کاوشوں کی ضرور پزیرائی کرینگے۔

اللہ کرے حسن قلم اور زیادہ



(۲رنومبر ۲۰۰۵ء)

پھول کانٹوں میں کھل گیا زاہد

غلام نبی ناظر: محقق۔شاعر۔:یاری پورہ کشمیر

''شعری مجموعے ''سلگتے چنار'' میں زاہد مختار نے اپنی زندگی اور اس میں روز افزوں پیش آمدہ رنگا رنگ واقعات، تجربات اور ترجیحات کو معروضی صورت میں سامنے لاکر صداقت کا دامن تھامتے ہوئے ایک تفصیلی خاکہ اس کتاب کے پیش لفظ ''یادوں کے فانوس'' عنوان کے تحت قارئین کے سامنے رکھا ہے جسکی وساطت سے اُسکے ذہنی، تصوراتی اور احساساتی دنیا کے مختلف جلوے قاری کی آنکھوں کے سامنے یکے بعد دیگرے عیاں ہو جاتے ہیں اور اس واقعاتی تفصیل و ترتیب کی روشنی اُسکی شاعری کی حدود اور وسعتوں کے بارے میں بہت حد تک اطلاع بہم پہنچاتی ہے۔

''سلگتے چنار'' زاہد کی غزلوں اور نظموں کا ایک مختصر مگر حسین مجموعہ ہے۔ آج تک زاہد نے بیسوں کشمیری اور اردو سیریل، افسانے اور ڈرامے لکھے ہیں جو ٹی وی اور ریڈیو سے نشر ہوتے رہتے ہیں اور برصغیر کے موقر رسائل میں شایع ہوئے ہیں اگر اُن کو جمع کیا جائے تو کئی کتابیں طباعت کے زیور سے آراستہ ہو سکتی ہیں۔ اس کتاب میں ایک حمد اور ایک نعت کے علاوہ ۳۴ غزلیں۔ ایک دونوں میاں بیوی کا مشترکہ تخلیقی عمل سے

آراستہ گیت اور ۲۲ نظمیں ہیں۔ یہ ہے ساری کائنات اس کتاب کے حسین اوراق پر ستاروں کی طرح پروئی ہوئی۔ یہاں زاؔہد کے فن اور ذہنی اُپج نے مل کر اُس کے قلم کو بہت حد تک ''ن، والقلمہ ومایسطرون'' کی معنوی حثییت، گہرائی اور گیرائی سے آراستہ کر دکھایا ہے اور اُسکی تخلیقی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

زاؔہد مختار کی غزلوں میں اُس کی زندگی، زندگی کے حادثات اور احساسات سے وابستہ مختلف ابواب اختصار اور نزاکت، شستہ گی اور زبان و بیان کی روانگی، الفاظ کے دروبست اور مخصوص عموماً مختصر بحور کا استعمال اور پھر فنی چابک دستی سے زیر قلم لاکر قاری کے تصورات کو حصول سرور انبساط کی رنگارنگی عطا کی ہے اور یوں ایک نئی اور پُرکشش دنیا آنکھوں کے سامنے پھرتی دکھائی دیتی ہے۔۔ زاؔہد خود ایک راہرو کے روپ میں ایک جذبہ، جوش اور شدت رسائی کا شوق لیکر ایک لامتناہی سفر پر روانہ ہو چلے ہیں

زاہد اپنے لمبے سفر پر تنہا تنہا تو بھی نہ تھا
تیرے تصور کے پردوں پر کوئی پھر کیوں چھایا ہے

اس سفر میں یہ بھی ممکن ہے کہ کہیں کہیں ٹھوکر بھی لگ جائے کیونکہ

''گرتے ہیں شہسوار ہی میدان جنگ میں''

لیکن ٹھوکروں کے امتحان میں سرخروئی حاصل کرنے والا ہی آخر بہ سلامت منزل مقصود سے ہمکنار ہوتا ہے۔ زاؔہد کی شاعری میں کچھ نمونے ضرور پرانی قدروں کے شکست و ریخت اور عقائد پر پڑنے والی ضربوں کی کسک کا منظر پیش کرتے ہیں

سبھی قبریں کشادہ ہو چکی ہیں۔۔!
زمیں اب تنگ ہوتی جا رہی ہے

ہم نے تتلی کے پروں پر لکھ دیا ہے اشتہار
کیوں کسی بے جان سے اخبار کی باتیں کریں

زاہد کے شعری مجموعے ''سلگتے چنار'' میں تشبیہ واستعارات کا حتی الامکان برمحل استعمال محتاج بیاں نہیں۔

کرنوں نے اک شعر کہا تھا رات نے دی تھی داد بہت
چاند نے چپکے چپکے گا کر سورج کو اُکسایا تھا

نظمیں بھی دلکش ہیں اور حقیقت بیانی سے لبریز ہو کر زمانے اور ماحول کی تبدیلیوں کا عکس من وعن لفظوں اور استعماراتی بیان لئے وجود پا گئی ہیں۔ ایک آخری چھوٹی نظم دیکھئے، پورا حال اپنے زمانے کا، تبدیلیوں کا اور شکست وریخت کا سامنے ہے

آواز کا پردہ
شاید برسوں پہلے
کسی زوردار آندھی کے
سامنے
ٹھہر نہ سکا
اب گرج، گونج
گھن گھور گھٹائیں اور
گرتی ہوئی دیواروں کا شور
سنائی نہیں دیتا
خاموشی قبرستان کی کتنی بھلی لگتی ہے

آخر پر زاہدؔ کے حق میں ایک شعر سوالیہ انداز میں پیش کرتا ہوں

تبسم کو لہو سے دھو گیا ہے
زمیں میں کون خنجر بو گیا ہے
تمہارے شہر میں کیا دلکشی ہے
نہیں لوٹا وہاں سے جو گیا ہے

اور.....میرا یہ تاثر

شاعری میں جمال آرا ہے
پھول کانٹوں میں کھل گیا زاہدؔ

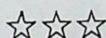
☆☆☆

(۱۰ جون ۲۰۰۵)

افسانوی شخصیت

—————— غلام نبی خیال ، مدیر ''وائس آف کشمیر'' محقق وادیب : سرینگر

........زاہد کی شخصیت ہی افسانوی ہے جس میں کئی جہتیں ہیں۔ میں زاہد کو ایک عرصہ دراز سے ایک فنکار ایک پرزینٹر (Presenter) اور قلمکار کے روپ میں جانتا ہوں اور مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ زاہد ایک حساس شاعر ہے ایک سلجھا ہوا افسانہ نویس ہے اور ایک اچھا ڈرامہ نگار ہے۔ میں زاہد کی کسی تخلیق کو پڑھے بغیر ہی کہہ سکتا ہوں کہ اُس میں کتنی گہرائی اور کتنی سنجیدگی ہوگی۔ کچھ لوگ جو اس وہم وگمان میں ہیں کہ کشمیر میں اردو ادب کا کوئی معتبر کارواں موجود نہیں اُنہیں سنجیدگی کے ساتھ زآہد مختار اور اس قبیل سے تعلق رکھنے والے قلمکاروں کی تخلیقات کو بھی زیرِ نظر لانا چاہئے۔



(۱۰ جون ۲۰۰۵)

گلہائے خلوص

(شہزادی سائمن: سابقہ ڈائریکٹر دوردرشن سرینگر) ــــــــــــــــــــــ

.........مجھے زاہد مختار کی دو کتابیں دیکھنے کے بعد ہی احساس ہو گیا کہ یہ کسی سنجیدہ انسان کی تحریریں ہونگی۔ مجھے اُنکی یادداشت میں بسے ہوئے لمحات سننے کو ملے جن کے ایک ایک نقطے میں ایک ایک افسانہ چھپا ہے۔ انہوں نے ہر ایک کی محبت پائی ہے اور وہ یقیناً اچھے انسان ہیں۔ دردمند دل رکھنے والے قلمکار ہیں۔........

(۱۰ر جون ۲۰۰۵ء : یوم اجرا)

☆☆☆

رو ماوانی : ایڈیشنل سکریٹری پلاننگ: سرینگر ــــــــــــــــــــــ

.........مجھے آج زاہد کی دو کتابوں کے اجرائ کے اس مبارک دن پر یہ احساس ہوا کہ جب میں نے زاہد کو پہلی بار دیکھا تھا تب سے دو دہائیاں گزر چکی ہیں۔ بیس سال قبل مجھے زاہد کی آنکھوں میں ایک طوفان نظر آیا تھا۔ ایک ایسا طوفان جس میں کئی سپنے چھپے تھے اور آج جب میں نے زاہد کو اتنے عرصے کے بعد دیکھا تو مجھے آج بھی اُس کی آنکھوں میں وہی طوفان نظر آیا۔ وہ تب بھی چناروں کی باتیں کیا کرتا ہے۔ اور آج جب اُس کی دو کتابیں ''سلگتے چنار'' اور ''جہلم کا تیسرا کنارہ' منظر عام پہ آئی ہیں تو مجھے لگتا ہے کہ زاہد کے کچھ سپنے پورے ہوئے ہیں۔ میری دعا ہے کہ زاہد کا ہر سپنا پورا ہو اور ہم سب اُس لمحے بھی اُن کے ساتھ ہوں۔..............

(۱۰ جون ۲۰۰۵ء: یوم اجرا)

زاہد کا افسانوی مجموعہ

عمر مجید: افسانہ نگار :سونہ وار سرینگر

............میں نہ ابہام کا دشمن ہوں اور نہ سہل پسندی کا قائل لیکن ایک افسانہ بنتا ہے جب اُس میں افسانے کے تمام لوازمات موجود ہوں۔ اردو افسانے کی عمر بہت زیادہ نہیں ہے ۔آج اردو میں سینکڑوں کی تعداد میں افسانے لکھے جا رہے ہیں اور پڑھے بھی جا رہے ہیں لیکن ان افسانوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے جو اپنا نقش تا دیر قائم رکھ پاتے ہیں۔ایک زمانے تک افسانوں سے کہانی کی گمشدگی کا بڑا چرچا رہا۔خیر سے وہ دور بھی گزرا اور افسانے میں کہانی کی واپسی ہوئی لیکن کیا واقعی کہانی کی واپسی ہوئی ہے۔اگر واقعی کہانی کی واپسی ہوئی ہے تو وہ کہانی کہاں ہے؟ کونسی ہے؟ اور وہ اپنا وجود منوانے میں آخر کامیاب کیوں نہیں؟ آج کوئی کہانی یادگار کیوں نہیں ہو پاتی۔ مطلب یہ کہ نہ پلاٹ ، نہ کردار ،بس واقعات ہی واقعات آج کے افسانوں کی شناخت میں ۔کیا کیا افسانہ واقعات کی کھتونی محض ہے۔.....ٹھیک ہے آج بھی کچھ افسانہ نگار ہیں جن کے یہاں افسانہ فکر و فن کی پاسداری کا نام ہے اور اُن کی کوشش ہوتی ہے کہ اُن کے افسانوں میں کہانی بھی ہو اور جاندار اور یادگار کردار بھی لیکن تان پھر وہیں آکر ٹوٹتی ہے کہ کیا یہ سب مذکورہ ترقی پسند افسانہ نگاروں کے افسانوں کے مدمقابل رکھے جا سکتے ہیں۔

آج کا قاری بے حد سیدھا سادا، معمولی پڑھا لکھا اور ہندی فلموں کے زیر اثر ہے اور ادبی رسالوں سے اس قدر خوف کھاتا ہے بلکہ بدکتا ہے جس طرح پانچویں جماعت کا ایک معصوم بچہ اپنے اسکول کے کسی سخت گیر استاد سے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جرائم، طلسماتی دنیا، پاکیزہ آنچل، خاتون مشرق جیسے رسالوں کے پیچھے بھاگتا ہے جبکہ شب خون شاعر، ایوان اردو، انشأ اور اسی قبیل کے ادبی جرائد بہت کم بکتے ہیں۔

ہمارے یہاں ''ادبی مزاج'' بہت کم ہے۔ ایسا کوئی ذریعہ نہیں ہے جس سے ایک آدمی علم و ادب اور خصوصاً ادب عالیہ میں دلچسپی لے۔ ماسوائے چند ایک اردو پڑھانے والے اساتذہ، لکچرار اور اُن کے طالب علم مجبوری کے تحت اردو پڑھتے ہیں۔ وہ ادبی ماحول اور ادبی مزاج سے کوسوں دور ہیں۔

منشی پریم چند سے یوسف میر ۲۰۰۵ تک یعنی اردو افسانے کی ایک سو سالہ تاریخ میں افسانے کی جو تعریف بیان کی جاسکتی ہے وہ آج کم وبیش ان الفاظ میں پیش کی جا سکتی ہے ''افسانہ ایک دل نشیں، مختصر نثر پارہ ہے جس میں کسی واقعہ، منظر، خیالی جذبہ، تجربہ، احساس، کردار یا روحانی کیفیت کو ایک ایسے موثر انداز میں پیش کیا جائے کہ وہ پڑھنے والے کے دل و دماغ پر بھرپور اثر ڈالے۔ اس کی یادداشت کا حصہ بن جائے اور اُسے زندگی کے معاملات سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ اور شعور بخشے۔

میرا یہ دعویٰ ہرگز نہیں کہ اردو افسانے کی یہ تعریف معتبر اور مکمل ہے۔ یہ اُدھوری بھی ہوسکتی ہے اور نامکمل بھی لیکن غلط ہرگز نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو افسانہ جس دور سے بھی گذرا کہانی، کردار اور ایک بھرپور تاثر کی تلاش میں رہا۔ رومانیت سے ترقی پسندی تک، جدیدیت سے مقصدیت تک، اردو افسانے کے ساز پر موت کی بھیانک خاموشی

کیسّر سجاتا ہے ۔ وادیٔ گلپوش میں یمبرزل بھی کھلتے رہے اور کار بیگار کی تلخیاں آنسوؤں میں ڈھلتی رہیں اور پریم ناتھ پردیسی نے دریائے جہلم میں '' رتن دیپ'' بہائے جن میں سے ایک آج '' جہلم کے تیسرے کنارے'' روشن ہے۔

زاہد مختار بیک وقت شاعر بھی ہے اور افسانہ نگار بھی ، صحافی بھی اور مصور بھی ۔ شاعر ہونے کا لوہا وہ بہت پہلے منوا چکے ہیں ، جس کے ہاں تبسُم کی خوشبو چھلنی ہو۔ لب کے صحرا میں تشنگی ہو۔ سلگتے چناروں کی برسی ہو، ننھی چھاؤں کا چھلم ہو، جہلم کا بدن عریاں ہو ۔ اُسے شعر کی شیرازہ بندی راس کیوں نہ آئے ۔ وہ اپنے دل ناصبور کی بے ہنگم دھڑکنوں میں محبتوں کے لالہ زاروں میں افسانوں کی مدہم سرگوشیاں کیوں نہ سنائے ۔

اُردو افسانے میں علامت نگاری کوئی نئی چیز نہیں ۔ اسکی اولین مثالیں ہمیں ابتدائی دور کے افسانوں میں بھی ملتی ہیں ۔ بحثیت ایک ، تاریخ یا رجحان کے علامت نگاری کو ۱۹۶۰ء کی دہائی میں فروغ ملا ۔ کافکا اور دوسرے فرانسیسی افسانہ نگاروں کی زیر اثر اُردو افسانے میں علامت اور تجدید کا استعمال شروع ہوا ۔ اس کا آغاز سریندر پرکاش ۔ بلراج منیر اور انتظار حسین اور انور سجاد نے کیا مگر بعض افسانہ نگاروں نے بے ڈھب اور مہمل جملے بازی کو جدیدیت سمجھ لیا ۔ کردار ، پلاٹ اور کہانی پن کو نظر انداز کیا جانے لگا جس سے افسانہ روکھا پھیکا اور بے ربط ہو گیا اور اردو افسانے کا قاری جو معمولی پڑھا لکھا تھا اردو افسانے سے کٹ کر رہا گیا لیکن اس غلطی کا جلد ہی احساس ہوا اور اردو افسانہ ابہام کی تاریکیوں میں بھٹک کر تجربوں اور تبدیلیوں کا ایک لمبا چکر کاٹ کر دوبارہ اپنی ڈگر پر آیا ۔

زاہد مختار نے لگ بھگ ۱۹۷۳ء میں افسانے لکھنے شروع کئے لیکن وہ کاروان ادب کے اُن شہسواروں میں سے تھے جو اردو افسانے کو نئے تجربوں کی روشنی میں پلاٹ ،

کردار اور کہانی لئے ہوئے استحکام دے رہے تھے۔ آپ کی علامتیں بے ڈھب مہمل جملے بازی جو ابہام کی اندھیری وادیوں میں بھٹک رہی ہوں نہیں۔ زاہد کے افسانوں میں ایک باضابطہ پلاٹ یا کم از کم کہانی پن ضرور ہوتا ہے اور کردار سازی بھی ہوتی ہے اور اسکے ساتھ ساتھ آپ کے افسانے روز بروز متنوع، عمیق اور توانا ہوتے جارہے ہیں۔

''سورج کا پہلا اندھیرا'' ہمارے بدنصیب دور کے سیاست دانوں پر ایک زناٹے دار تھپڑ ہے جن کا خدا جھوٹ اور کذب ہے اور جھوٹ کے سوا کچھ نہیں ''اصل بات تو وہ تب بولتا ہے جب ٹی وی کا کیمرہ آن نہیں ہوتا''

''لمحے کا سفر'' وقت اور تاریخ کا سیدھا سادھا امتزاج ہونے کے باوجود وقت کی جادوگری کا مظہر ہے۔ لوگوں کا ایک ٹھاٹیں مارتا ہوا سمندر گھر پر لگی ہوئی خوبصورت گھڑی کو'' وقت کا سفر'' شروع کرتے ہوئے دیکھنے کے لئے بے تاب تھا لیکن اُن سوئیوں کی حرکت یا تو لیڈر نے دیکھی یا پھر اُس کے کمانڈوز نے۔ عام لوگوں کو دوسرے دن پتہ چلا کہ واقعی گھنٹہ گھر کی وہ گھڑی اپنے محور پر گھوم رہی ہے۔

''باسی روٹی'' اور'' باسی خبر'' میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ انسان کا پیٹ خالی ہو تو باسی روٹی شکریہ کے ساتھ حلق کے نیچے انڈیل دیتا ہے۔ گُلبدن کہیں بازار میں بکتی ہے اور کہیں اُسے پیدا ہوتے ہی دفن کیا جاتا ہے اور کہیں ستی ہونے کے لئے مجبور کیا جاتا ہے اور کہیں اسے مختصر سی بکنی اور دو انچ کی انگیا میں ناچنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ مرد بڑا کمینہ ہے اور کینہ پرور بھی۔

''پل صراط'' سے گزرنا آسان کام ہوگا لیکن تضحیک آمیز شناختی پریڈ کے دوران کسی مخبر کے سامنے سے گزرنا انتہائی دشوار کام۔

''جہلم کا تیسرا کنارہ'' میرے خیال میں اس صدی کے بہترین افسانوں میں شمار کئے جانے کے قابل ہے۔

مجموعہ افسانہ ''جہلم کا تیسرا کنارا'' پڑھنے کے بعد زاہدؔ مختار سے بڑی امیدیں وابستہ ہوگئی ہیں۔ کتاب کا گٹ اپ خوبصورت ہے اور کتاب بڑی محنت سے چھاپی گئی ہے۔

☆☆☆

(۱۳ مئی ۲۰۰۶)

زاہدؔ مختار کی زیر طبع تصنیفات

☆ پروں سے پنجوں تک ‹ اردو ناول›
☆ من و عن ‹ ایک حقیقت، ایک تاریخ›
☆ مٹھی بھر چھاؤں ‹ اردو ڈراموں کا مجموعہ›

سخت جان......زاہد

شمس الدین شمیم : قلمکار : دوردرشن سرینگر

بڑا سخت جان ہے جنوبی کشمیر کے اُفق پر یہ ستارہ.....زاہد مختار..... معلوم نہیں یہ سماجی ذمہ داریوں کے مخمصے میں اُلجھے رہنے کے باوجود وادی کے ان دیکھے درد و کرب کو زبان دینے کے لئے کیسے ادبی نشستوں کا اہتمام کرتا ہے۔ کیا بچے اطراف میں نہیں ہوتے۔ کیا اہلیہ محترمہ گونگی اور بہری ہے۔ شاید رشتے ناطے بھی نہیں ہونگے۔ اسی لئے تو تخلیق پہ تخلیق ہاتھ میں لئے ہوئے دکھائی دیتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ.........

بچے بھی اطراف میں ہیں۔ اہلیہ محترمہ نہ گونگی ہے اور نہ بہری۔ رشتے ناطے بھی ہیں۔ اس کے باوجود وہ لکھتے رہتے ہیں۔ اُن کی تخلیقات دیکھ کر مجھے اپنے آپ پہ شرم آتی ہے کہ میں اردو کہانیوں کے مجموعے ''ویرانے'' کے بعد اپنی ڈھیر ساری اردو اور کشمیری کہانیوں یا تحریر کردہ ڈراموں کو ابھی تک شائع نہ کر سکا۔ میں زاہد مختار کو سلام کرتا ہوں

''جہلم کا تیسرا کنارا'' میں اُن کے ۲۹ افسانے شایع ہوئے ہیں اور اس سے قبل ''سلگتے چنار'' شعری مجموعہ بھی شایع ہوا ہے۔ جہاں تک افسانوی مجموعے کا تعلق ہے اِس میں چھپے افسانے ایک قاری کے لئے غور و فکر کی راہیں کھول دیتے ہیں۔ زاہد کی

کہانیوں سے وادی کی سوندھی سوندھی خوشبو آتی ہے اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ بڑے بازار میں جو اَن دیکھی باتیں پوشیدہ رہ جاتی ہیں اُنہیں زاہد مختار نے چرا کر قلم کے ذریعے ہم سب کے سامنے رکھا ہے اور ہم دنیاوی زندگی میں اُلجھے رہنے کے باوجود اُن کی تخلیقات کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں

زاہد مختار کی شعری تخلیقات ''سلگتے چنار'' میں بھی اسی طرح کا سلسلہ ہے۔ وہ کہتے ہیں

لہو کا اک سمندر پی چکا ہوں میں ہر اک زخم دل کا سی چکا ہوں
کہ خود میں قید رہ کر عمر گزری سزائیں کاٹ کر میں جی چکا ہوں

اس بات سے آپ سمجھ گئے ہونگے کہ زاہد مختار کہاں ہے۔ اُن کا مقام کیا ہے۔

میری اُن سے ایک ہی گزارش ہے کہ آئندہ اُن کی کہانیوں میں وادی کی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو ہر سو پھیلنی چاہئے اور یہ بھی عرض ہے کہ وہ کشمیر کے معاملے کے تناظر میں سیاسی کرداروں کی ان دیکھی باتوں کو بھی حقیقی شکل میں پیش کریں۔ یہ ایک بہت بڑی سماجی خدمت ہوگی کیونکہ نئی نسل سیاسی داؤ پیچ کے ماہرین کو بہت مقدس سمجھ رہی ہیں اور اُن کو ہاتھوں ہاتھ لے رہی ہے

☆☆☆

(۷راپریل ۲۰۰۶ء)

جہلم کے تیسرے کنارے پر.....

بشیر منظر :مدیر ''کشمیر امیجز'' سرینگر

موت کا خیال کبھی مجھ پر لرزہ طاری کرتا ہے۔۔ یا شاید کرتا تھا کیونکہ میں اکثر موت کی منطق تلاش کرنے میں سرگرداں رہتا تھا...... جب ایک چیز تخلیق کی جائے تو پھر اسکے مقدر میں فنا لکھنے کا کیا مقصد... اکثر یہ سوال مجھے اندر سے کریدتا رہتا.....!

اور زاہد مختار، اس سوال کا جواب لیکر آ گیا......... ایک ایسا نقطہ لئے جس نے موت کی منطق بھی عیاں کی اور اسکا مقصد بھی... اسی لئے شائد اب مجھے موت کا خیال خوفزدہ نہیں کرتا.. اب ایسی کوئی کیفیت مجھ پہ طاری نہیں ہوتی۔...... ذریعہ اطمینان ... .زاہد مختار......... ایک ہمہ جہت شخصیت، ایک شاعر، ڈرامہ نگار، کہانی کار، صحافی، اداکار اور بہت کچھ۔

زاہد اننت ناگ کی اُس زرخیز زمین سے اُبھرا ہے جسے وہ اسلام آباد کہنا زیادہ پسند کرتا ہے لیکن میں اننت ناگ کے صوتی تاثر سے اس حد تک مانوس ہو چکا ہوں کہ میں سُر کو بگاڑنے کا مرتکب نہیں ہونا چاہتا.........!

''جہلم کا تیسرا کنارہ'' زاہد مختار کے افسانوں کا تازہ ترین مجموعہ ہے۔ حسین

اور دل کو چھو لینے والے گٹ اپ کے ساتھ ''جس کا سہرا عادل بن مختار کے سر بندھتا ہے''
اس افسانوی مجموعے میں ۲۷ کہانیاں اور تیراں صفحات پہ پھیلی ہوئی تخلیقی ارتقاء میں
کروٹیں بدلنے والی فلسفیانہ تحریر نہایت ہی سادہ زبان میں ''برق تخیل'' کے عنوان تلے
موجود ہے۔ زاہد اپنی اس کتاب کو اپنے والدِ محترم کے نام منسوب کر چکا ہے جن کے علمی
شغف نے زاہد کو طالب علم و فن بنا دیا ہے۔

زاہد مجھے منٹو کی یاد نہیں دلاتا لیکن زاہد کو پڑھتے ہوئے مجھے منٹو اپنے قریب ہی کہیں مسکراتا ہوا محسوس ہوا ہے۔ زاہد بھی عام آدمی کی طرح زندگی اور اُسکے گونا گوں مسائل کی بات کرتا ہے لیکن اسکا اپنا الگ انداز ہے۔ حالانکہ وہ سماج کے کوڑے دان میں منٹو کی طرح ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہیں کرتا۔

منٹو کی طرح بے باک نہ ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ زاہد بے باکی سے کتراتا ہے۔ وہ کوشش تو کرتا ہے لیکن شاید سماجی بندشیں یا اخلاقی تقاضے اُسکے آڑھے آ کر اُسے ہچکچانے پر مجبور کر رہے ہیں اس کے باوجود اُسکا افسانہ ''بند دروازہ'' اُس ''شجر ممنوع'' کے بارے میں زاہد کے احساسات کا اعلیٰ ترجمان ہے جسے منٹو عریاں کرنے سے نہیں ہچکچاتا تھا۔

اپنے ابتدائی تاثر موت اور اُس کی منطق کے بارے میں مجھے زاہد کا افسانہ ''نجات'' پڑھنے کو ملا۔ اس افسانے میں زاہد نے اپنے انداز سے اُن لوگوں کی بے بسی کا خاکہ کھینچا ہے جو موت کو مار کر لافانی زندگی کے دعویدار بن بیٹھے ہیں۔ افسانے کا مرکزی کردار جس طرح سے آخر میں واپس اُس شہر کی جانب لوٹنے کا فیصلہ کرتا ہے جہاں موت ابھی بھی زندہ ہوتی ہے۔ وہی فیصلہ موت کی منطق عیاں کرتا ہے۔

زاہدؔ کا ہر لفظ کشمیر کے بارے میں ہے۔ یہاں کے لوگ، یہاں کی زمین، یہاں کا آسمان، وہ جہلم کی باتیں کرتا ہے۔ اُن لوگوں کی باتیں کرتا ہے جو جہلم کے پانیوں اور اُس کے کناروں پہ رہتے ہیں اور اُن لوگوں کی جو جہلم کے دونوں کناروں سے بے دخل ہوکر ''تیسرے کنارے'' کے متلاشی ہیں۔

ہر تخلیق کار کے لئے تیسری آنکھ لازم ہے۔ لارڈ شیوا کی طرح اور زاہدؔ اسی تیسری آنکھ سے ایک عام آدمی کی محرومیوں کو دیکھتا ہے۔

درد، عتاب، انبساط، شہوت، غربت، محرومی، نفرت، ہدایت، شرافت...جو کچھ بھی اس سماج میں ہے وہ زاہدؔ کے افسانوں میں موجزن ہے اور اُسکا جادوئی قلم ہر کردار کو زندہ و جاوید بنا دیتا ہے۔ باسی روٹی کی ''گلبدنؔ'' ہو، ''لمحے کا سفر'' کا ''سونہ جو'' یا ''تلخیاں'' کی ریشماں' سارے کردار سماج کے قرطاس پر متحرک دکھائی دیتے ہیں بس اُنہیں دیکھنے کے لئے ''تیسری آنکھ'' درکار ہے۔ کشمیریوں کا درد زاہد کے افسانوں میں صاف جھلکتا ہے ''پہلا چہرا'' اُس صورتحال کی ایک بے باک روداد ہے جس سے ہر کشمیری ایک عرصے سے گزر رہا ہے۔ تخلیق کار کی تیسری آنکھ کبھی نہیں سوتی۔ اسے ہر پل، ہر لمحے کا جائزہ لینا پڑتا ہے، ہر سانحے کی تصویر کا عکس اپنے آئینے میں اُتارنا پڑتا ہے

منٹوؔ کی تیسری آنکھ اپنے سماج کی ہر غلاظت اور بدصورتی دیکھنے کی سکت رکھتی تھی اس لئے اس کے باطن کو عریاں کرنے کے دوران وہ تضحیک کا بھی نشانہ بنا حالانکہ اُن نشتروں نے منٹو کے جنون کو مجروح یا پامال کرنے میں کامیابی حاصل نہیں کی کیونکہ منٹو جانتا تھا کہ اُسکی عریاں کردہ سچائیوں کا اعتراف خود زمانہ بھی دبے لفظوں میں کر رہا ہے۔ زاہد بھی اپنی تیسری آنکھ کھلی رکھنے میں عملی جرأت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اس لئے

وہ بھی سب کچھ دیکھتا ہے...سب کچھ جسے دوسرے دیکھنا یا دکھانا پسند نہیں کرتے۔ زاہد منٹو نہیں ہے جیسا کہ اُس نے خود بخوبی کہا ہے کہ زاہد منٹو نہیں بن سکتا لیکن منٹو بھی زاہد کے قالب میں نہیں سما سکتا۔

یہ بات بھی درست ہے کہ ہر تخلیق کار یا تخلیق کارہ کی اپنی ایک انفرادیت ہوتی ہے۔ اپنا ایک منفرد انداز اور منفرد شناخت۔ برسوں سے اہل قلم کئی نازک موضوعات کے ساتھ چھیڑ خوانی کرتے آئے ہیں لیکن اہم نقطہ یہ ہے کہ کتنے صاحبِ قلم ان موضوعات کے ساتھ انصاف کر پائے ہیں۔ اس ضمن میں زاہد کا اپنا ایک پروقار انداز ہے۔ منٹو سے جدا سہی لیکن زاہد کی اپنی انفرادیت کا ضامن۔

''وفا'' ذہن و دل کو جھنجھوڑنے والی ایک ایسی مختصر کہانی ہے جسے پڑھنے کے بعد اس بات کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ زاہد کسی بھی حساس موضوع کو سنوارنے کے فن سے واقف ہے۔ زاہد تخیل کے عروج کا متقاضی ہے۔ اُس تخیل کا جو زندگی کے اتنے قریب ہے کہ کبھی تصور پر بھی حیات کا گماں ہوتا ہے۔

المختصر زاہد کا افسانوی مجموعہ ''جہلم کا تیسرا کنارا'' مطالعے کی دلچسپی کا ضامن ہی نہیں بلکہ قلم کار کے اندروں میں موجزن طوفان کا عکاس بھی۔

زاہد کی روح بے تاب ہے اور وہ زندگی کی تڑپ اور اُسکے اسرار سے پردہ اُٹھانے کا خواہشمند۔

زاہد کا رخش سفر، رو میں ہے اور اُس کے قلم کی سیاہی خشک نہیں ہو سکتی......!



(اگست ۲۰۰۶ء)

آگ اور پانی کا سنگم

عطا محمد میر: قلمکار : قاضی باغ، اسلام آباد کشمیر

انسان کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ آب و آتش اور خاک و باد کا مرکب ہے اور ان انتہائی متضاد اجزأ کو ایک غیر مری قوت ''روح'' باہم منضبط کئے ہوئے ہے۔ جب میں زاہد مختار سے شناسا ہوا، میں نے مذکورہ بنیادی عناصر کے علاوہ اُسے تندی، تلخی اور محبت و مٹھاس کا بھی ایک پیکر پایا۔ اُن کے اندر اور بھی بہت سی تلخ و شرین چیزیں دریافت کی جاسکتی ہیں۔ وہ یک رنگی نہیں۔ بوقلموں ہیں، اپنی تحریروں کی طرح وہ نثر بھی ہیں، نظم بھی، ڈرامہ بھی اور برق تخیل کی طرح سنجیدہ بھی۔ اُن کے یہاں آتش چنار بھی ہے، جہلم کا پانی بھی۔ وہ دیکھتے ہیں تو ''تیسرا کنارا'' دریافت کرتے ہیں۔ وہ سلگتے چنار کے سائے تلے ٹھنڈی نظمیں اور غزلیں تحریر کر کے اپنی جسامت۔ قد اور نظر کا لوہا منواتے ہیں۔ اپنی بوقلموں زندگی کے مختلف مراحل طے کرتے کرتے وہ اپنے نثر و نظم کے ساتھ ادبی حلقوں میں دور دور تک جانے جاتے ہیں۔ اس میدان میں اُن کے ساتھ اختلاف بھی کیا جاسکتا ہے اور میں نے زاہد کے خیالات سے کئی دفعہ اختلاف کیا بھی ہے کہ اُن کی بعض تحریریں، خیالات اور احساسات میرے من کو نہیں بھاتے مگر بہت جلد مجھے احساس

ہوا کہ ایسے ہی شخص کے ساتھ اختلاف کیا جا سکتا ہے کیونکہ وہ زندگی کے کئی رنگوں سے آشنا ہیں اور ہر رنگ کا اُن کے یہاں اپنا معنیٰ و مفہوم لئے ہوئے ہے۔ ایسے شخص کے ساتھ اختلاف کرنا ایک نعمت ہے اور نفرت کرنا فطرت سے بغاوت کے مترادف کیونکہ زاہدؔ کے یہاں خیالات کے قطرے نہیں، سوچ کے سمندر ہیں۔ وہ بولتے نہیں برستے ہیں۔ اُن کے یہاں الفاظ کا پیچ وخم محبوب کے زلفوں کی طرح نرم و ملائم بھی ہے اور گرج چمک کی تند اور بادل کی طرح سبک رو بھی۔ یہ مطالعے و مشاہدے کا ہی اعجاز ہے کہ وہاں ابتدا بھی ہے اور انتہا بھی۔ مشاہدہ اگر یک رنگی ہے تو خشک اور اُکتاہٹ کا باعث بنتا ہے۔ سچا قلمکار Monotomy کا شکار نہیں ہوتا۔ اگر پہلا شعر آخری شعر تک قاری کو اپنے بس میں نہیں کرتا تو اسے شاعر کی کم مائیگی اور سطحی مشاہدے کا ہی نام دیا جا سکتا ہے۔ قدرت کا قانون ایسا ہے کہ پختگی چالیس کے بعد ہی حاصل ہوتی ہے اور پختگی کی اسی عمر میں زاہدؔ کا شعری مجموعہ ''سلگتے چنار'' اور افسانوی مجموعہ ''جہلم کا تیسرا کنارہ'' منظر عام پہ آیا۔ ہر کتاب قلمکار کی پوری نہیں تو آدھی زندگی کا آئینہ ہوتی ہے اور باقی آدھی کتاب اُن لوگوں کی جن کو قدرت جسم و جان عطا تو کرتا ہے مگر حروف تحریر کرنے کی صلاحیت نہیں دیتا۔ اس طرح قدرت قلم کار کے ذریعے اُن لوگوں کی داستان لکھواتا ہے جو اُن کے اردگرد زیریں کردار کی طرح محو حرکت ہوتے ہیں۔ یوں زاہدؔ نے اپنی آدھی زندگی کا حق ادا کر دیا ہے اور ہم جیسے بے نثر و نظم انسانوں کی آدھی زندگی کا بھی۔ میں خود شعر گو نہیں اور نہ افسانہ میری صنف ہے مگر میں ان دونوں اصناف سے محبت رکھتا ہوں اور انکے معنیٰ و مفہوم کے علاوہ ان کے بین السطور مدعا کو جاننے کی بھی سعی کرتا ہوں۔ اسی تناظر میں جب میں نے ''سلگتے چنار'' کا مطالعہ کیا تو بعض غزلوں میں مجھے اپنی ترجمانی محسوس ہوئی۔ اس

مجموعے کے نثری صفحات ''یادوں کے فانوس'' زاہد کی جرأت مندی کے غماز ہیں۔ یہ ''پدرم سلطان بود'' سے کوسوں دور ایک جدوجہد کرنے والے شخص کی داستان ہیں کہ وہ زندگی کو کس طرح دیکھتا ہے، محسوس کرتا ہے اور گزارتا ہے اور دنیا میں اپنا ایک نام کماتا ہے اس تحریر کے بعض جملوں نے مجھے اشکبار کیا۔ کچھ نے حوصلہ دیا اور کچھ نے زندگی سے آنکھیں ملانے کی تحریک دی۔ ''سلگتے چنار'' یادوں کی ایک کتاب ہے۔ اس میں ہمارا بچپن بھی نظر آتا ہے۔ ''انجانی محبوبہ'' کی تکتی نگاہیں بھی، حالات کی تلخیاں بھی اور وہ سب کچھ جو آج تک جہلم دیکھتا آیا ہے۔

مخملی دھرتی پہ ڈالی کس نے راکھ
آنکھ سے اوجھل دفینے ہو گئے

☆☆☆

قلم تختی، سیاہی، حرف، کاغذ
میرے اندر کا بچپن سو گیا ہے

☆☆☆

ہر اک آنکھ میں نیلا پتھر، اپنا شہر پرایا سا
گلی گلی میں ہر سو بنکر، اپنا شہر پرایا سا
آوازوں کی قبروں پر ہے خاموشی کی چیخ و پکار
سارے مکیں ہیں جیسے بے گھر، اپنا شہر پرایا سا

☆☆☆

میں زمیں کی سرحدوں کا جب نہیں قائل تو پھر
وہ میرے حصے کا کیسے آسماں لے جائے گا

☆☆☆

قاتل ہماری جرأتوں سے بوکھلا گیا
اب تیر پھینکتا ہے کہ جب سر نہیں رہا

ایسے سیکڑوں اشعار قلم بند کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ ایک پُر مشقت۔ دِقت طلب اور محنت شاقہ والا عمل ہے۔ واضح حالات وواقعات کے علاوہ زاہد کسی انجانی محبوبہ کی زلفوں کا بھی اظہار کرتا ہے مگر وہ گرہیں بند ہی رہیں ہیں۔

تیرے شہر میں اک شہزادہ سیدھا سادھا آیا تھا
کچھ پل گم صم ٹھہرا لیکن، کچھ کھویا، کچھ پایا تھا

☆☆☆

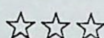
میرے گھر کے دروازے پر کس نے لکھا ہے کاجل سے
ٹکڑا ٹکڑا کوئی آنچل جب لہرائے، تم آنا

☆☆☆

زاہد نے ''جہلم کا ایک تیسرا کنارہ'' دریافت کیا ہے۔ ''تیسرا کنارہ'' بڑا معنی آفرین لفظ ہے۔ اس میں ایک قوم کی شناخت کا احساس چھپا ہے۔ ''تیسرا کنارہ'' صرف تیسری آنکھ سے ہی نظر آتا ہے جس کو ہم ادیب چشم بینا سے تعبیر کرتے ہیں۔ جہلم جہاں سے بہتا ہے، وہ صرف دو کناروں والا علاقہ نہیں بلکہ اس کا ایک اہم کنارہ ''کشمیریت'' کا کنارہ ہے۔ جو لوگ اس افسانوی مجموعے میں شامل کئی افسانوں کا مطالعہ کرینگے اُنہیں

زاہد کی چشم بینا بھی نظر نواز ہوگی۔ یہ وہ نظر ہے جو ''پل صراط'' دیکھتی ہے۔ ''سورج کا پہلا اندھیرا'' بیان کرتی ہے'' لمحے کا سفر'' اور '' باسی روٹی'' جیسی تحریروں سے قاری کو پنہاں درد کا احساس دلاتی ہیں۔ ایسے افسانے ایک تواریخ بنتے ہیں اور ایسے ہی افسانے اُن انسانوں اور قوموں کی کہانیاں ہوتی ہیں جن کو اپنی شناخت ظاہر کرتے کرتے بڑھاپا آگھیرتا ہے۔

نثر و نظم کی ان دو کتابوں میں چنار کی تپش بھی ہے۔ باد صبا بھی، ان میں چھاؤں بھی ہے اور جہلم کی متانت بھی۔ اس میں دریا کی سادگی بھی ہے اور سیلاب بھی۔ یہ کتابیں سیر حاصل بحث کرنے کی دعوت دیتی ہیں اور سیر حاصل بحث بغور مطالعہ کے بِنا ناممکن ہے۔ میرے خیال میں میری ذاتی لائبریری کچھ کمی محسوس کر رہی تھی۔ زاہد کی ان دو کتابوں نے وہ کمی پوری کردی۔



وادیٔ کشمیر کا خاکہ

نفیس انصاری: قلمکار، کھیری: یوپی

''اور ساز تھم گیا'' وفا، خلیج، بند دروازہ، فرق، فرار، کسوٹی اور شر پسند افسانے کئی بار پڑھے۔، مندرجہ بالا افسانوں میں ''شر پسند، وفا، خلیج، فرق اور کسوٹی بہت اچھے لگے لیکن ''شر پسند'' کو چھوڑ کر کوئی بھی افسانہ کشمیر کی نمائندگی کرتا ہوا نظر نہیں آیا سبھی افسانوں کا پلاٹ میرے قرب و جوار کے معاشرے سے لیا ہوا لگا ۔ میں ایسے افسانے کا منتظر تھا جو کشمیر کے درد کا احساس کراتا ہو...اسی اضطراب کی کیفیت میں ''سورج کا پہلا اندھیرا'' ''لمحے کا سفر'' اور پُل صراط'' افسانے نظر نواز ہوئے...نظروں کے سامنے کشمیر کی وادیوں کا خاکہ کھنچتا چلا گیا اور میرے احساس میں شدت آ گئی ''پل صراط'' اور ''لمحے کا سفر'' افسانوں میں کردار اپنی پوری طاقت کے ساتھ نمودار ہوئے ہیں۔ ''لمحے کا سفر'' کا ''اکبر جو'' افسانے سے نکل کر میرے سامنے آ بیٹھا۔ ایسا لگا کہ جیسے وہ میرے قرب و جوار ہیں ہے اور اس افسانے کی ٹریجڈی یوپی کے ہی کسی شہر کی ہے۔ ''پل صراط'' افسانے نے اپنے عنوان کی ہی طرح اپنے انجام سے چونکا کر بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔

☆☆☆

زاہدؔ مختار....جذبوں کا شاعر

مقبول وی، رےؔ : صحافی وشاعر: اسلام آباد کشمیر

زاہدؔ مختار نے اپنا ادبی سفر افسانہ نگار کی حثیت سے شروع کیا اور جلد ہی وہ اپنے معاصرین میں ایک نمایاں مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے ۔ زاہدؔ مختار نے اچھوتے موضوعات پر افسانے تخلیق کر کے خود کو ریاست کے اچھے لکھنے والوں کی فہرست میں شامل کر دیا۔

زاہدؔ مختار نے شاعری کو ثانوی درجہ دیا اور ابتدا میں مشاعرے میں شرکت کے لئے یا شاعر دوستوں کی فرمائش پر شاعری تخلیق کرتے رہے۔ اُن کی ابتدائی شاعری میں رومان پسندی کا عنصر غالب ہے لیکن گذشتہ بیس برسوں کے دوران زاہد نے جو شاعری تخلیق کی اُس میں اُن کی فکری وسعت ، جذبوں کی گہرائی اور شعور کے کھلے پن کا برملا اظہار ہوتا ہے۔

زاہدؔ مختار نے نئے فلسفے اور نئی فکر سے استفادہ تو کیا لیکن اُنہوں نے قدیم نظریات اور روایات کو یکسر مسترد نہیں کیا اور یہی اُن کی سب سے بڑی خوبی ہے...خدا فراموشی اور دین بیزاری کے اس ماحول میں بھی وہ قدرت کی ثنا خوانی کو اپنے جذبوں کی بنیاد بناتے رہے اور دین کو زندگی سے الگ کرنے کے سخت خلاف رہے۔

وہ ادب برائے زندگی کے قائل ہیں اور زندگی میں نیکی، اچھائی اور خوبصورتی کے اقدار کو فروغ دینا ہی اُن کے نزدیک اچھے اور تعمیری ادب کی پہچان ہے۔

زاہد کی نظموں میں ہلکا سا ابہام ضرور ہوتا ہے لیکن یہ ابہام اُن کی شاعری کو پیچیدہ نہیں بناتا بلکہ قاری کو کئی رنگوں، کئی لذتوں سے آشنا کراتا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ زاہد مختار کا شعری مجموعہ اردو دنیا میں شوق سے پڑھا جائے گا اور یہ کشمیر کے ادیبوں اور شاعروں کے لئے بھی عزت کا باعث بنے گا کیونکہ کشمیر کے بارے میں بعض زبان دانوں کا یہ کہنا ہے کہ اس سرزمین پر زبان دان کم ہی ہیں لیکن زاہد مختار کی اردو میں وہ مٹھاس ہے جو شاید کڑوی زبانوں کو بھی شہد کی لذت سے آشنا کرائے گی۔... کشمیر میں پیدا ہونے والے زاہد مختار کی زبان ملک کے کسی بھی اہل زبان کی تحریر کے مدمقابل رکھی جاسکتی ہے۔



ایک وادی جہلم کے کنارے

بشیر تعمیل : (ایس ایس پی) قلمکار: بارہمولہ

سلگتے چناروں کی تپش سے
اپنے ذہن میں اُلجھے ہوئے
چند معصوم خیالات کو پختہ کیا
اور یہ ٹھان لی
کہ میں بھی سجاؤں گا
اپنے خوابوں کی وادی کو
جہلم کے تیسرے کنارے پر
جسے زاہد نے اپنے نام کیا ہے
اُمید ہے جذبہ دوستی کو نبھاتے ہوئے
تھوڑی سی جگہ ملے گی ضرور

☆☆☆

(۱۵رمئی ۲۰۰۶ء)

اجنبی شہر کے اجنبی راستے

ڈاکٹر حسرت حسین: مصنف و شاعر: سنی گام یاری پورہ کشمیر

.....اردو زبان وادب کو ترقی پسند تحریک سے لیکر دور جدید تک نئی راستوں پر گامزن کرانے میں کئی ادبا پیش پیش رہے ہیں۔ اردو شعر وادب میں کئی چھوٹے بڑے ادیب برصغیر و ہند و پاک کے بٹوارے کے ساتھ ہی کشمیر کے ادبی مسند پر جلوہ فگن ہوئے اور یہ سلسلہ آج کے اس پُر آشوب دور تک برابر اپنی آب وتاب کے ساتھ قائم ہے۔

اردو زبان کی اس پچاس سالہ تواریخ میں زاہد مختار بھی اپنی ایک شاعرانہ شناخت اور پہچان لئے ہوئے ہیں۔ زاہد مختار کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ یہ خوش پوش، خوش نویس اور خوش پسند شخص ایک آرٹسٹ اور ڈرامہ نگار ہونے کے علاوہ ایک معروف شاعر بھی ہے۔ زاہد مختار کی شاعری جدید ادبی تقاضوں سے لیس ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے شاعرانہ وصف اور محاسن سے عین اُسی طرح مالا مال ہے جیسے کسی حسین گلستان میں کھلتے ہوئے مست و مدہوش مہکے مہکے گلابی رنگ سے شرابور گلاب کے پھول۔

زاہد مختار کی فطرت میں شعر وشاعری کی دھنک اس قدر رچ بس گئی ہے کہ بسا اوقات مجھے زاہد کی ہر بات شاعری کی تمثیل محسوس ہوتی ہے

زاہد مختار نے اپنی ایک طویل نظم کتابچے کی شکل میں شایع کی ہے۔ ۳۲ صفحات پہ مشتمل ''اجنبی شہر کے اجنبی راستے'' کا ہر مصرعہ ''اجنبی'' لفظ یا یوں کہئے ایک ادبی

علامت سے شروع ہوتا ہے۔ زاہد نے مذکورہ نظم کو رباعی طرز پر چار چار مصرعوں پر منقسم کر کے اگرچہ پڑھنے والے کے لئے بظاہر آسانی پیدا کر دی ہے مگر اس سے نظم کی روانی بھی متاثر ہوئی ہے۔ یہ نظم ایک سو چار اشعار یعنی دو سو آٹھ مصرعوں پر مشتمل ہے اور نظم کی انفرادی خصوصیت اس بات میں مضمر ہے کہ ہر مصرعہ ''اجنبی'' لفظ سے ایسے شروع ہوتا ہے کہ ہر جگہ اجنبی لفظ اپنے عام مفہوم سے اوپر اُٹھ کر نئے نئے لبادے اوڑھ کر اپنے استعاراتی رنگ و روغن کے ساتھ پوری نظم میں اول سے آخر تک ایک تیز طرار دریا کی مانند اپنے دائیں بائیں کی وادیوں سے بغلگیر ہو کر اپنا منکشفانہ شعری سفر طے کر کے قدم قدم پر نت نئے احساسات اور جذبات کو دور جدید کے کرب وفغاں کی آہوں اور سسکیوں کے منظر نامے کی زینت بنائے بنا نہیں چھوڑتا۔ دیکھا جائے تو اس شعری صورتحال کو اُبھارنے میں زاہدؔ مختار کو یدطولیٰ کا مثالی اسرار ورموز حاصل ہے

بہر کیف جب ہم دور جدید کے اردو ادب پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں زاہدؔ مختار کی ''اجنبی'' نظم بہت کچھ سوچنے پر آمادہ کرتی ہے۔ اولاً مذکورہ نظم میں بیسوں ایسی ادبی اصطلاحات کا سامنا ہوتا ہے جو اپنی حثیت کے اعتبار سے فکر انگیز اور سرور بخش ہیں۔ ثانیاً ''اجنبی'' لفظ خود ایک ایسی ڈرامائیت کو جنم دیتا ہے جس سے کشمیر کی موجودہ سیاسی ٹریجڈی کی عکاسی ہوتی ہے۔ مجموعی طور پر زاہدؔ مختار کی یہ ادبی کاوش لایق ستائش ہے۔



(۱۸ر ستمبر ۲۰۰۵ء)

بے ساختگی کا مظہر شعری مجموعہ

اقبال اکرم وارثی: قلمکار۔شاعر، کھیری: یوپی

پاکیزہ، صاف ستھری اور تعمیری شاعری کا مجموعہ ''سلگتے چنار'' اپنے اندر جہاں ایک طرف میرؔ اور غالبؔ کی روایت سمیٹے ہوئے ہے وہیں دوسری جانب عصر حال کا آئینہ بھی ہے۔ یہ فکریں زاہدؔ مختار کے اس احساس کا نتیجہ ہیں جو ظلم واجتبد اد دیکھ کر تڑپ کا شکار ہوتا ہے اور یوں اسی تڑپ سے ''سلگتے چنار'' جنم لیتا ہے۔

زاہد مختار اردو کے اچھے شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔ انکے مجموعے میں حمد، نعت، غزلوں کے علاوہ آزاد نظمیں بھی شامل ہیں جو اُنکے سچے اور انسانی جذبات اور احساسات کی آئینہ دار ہیں۔ غزلیں نہ صرف بہترین الفاظ کی بندشوں سے آراستہ ہیں بلکہ ایک عہد کی منظر کشی بھی کرتی ہیں .... شاعر کے اشعار اُسکی زندگی کے تجربات و مشاہدات کے عکاس ہوتے ہیں۔ میں جب زاہدؔ مختار کو اس آئینہ میں دیکھتا ہوں تو مجھے حیرت ہوتی ہے کہ ایک دوست نواز سادہ لوح انسان میں یہ گہرائیاں ! اُن کا ایک ایک شعر اُن کے اعتماد کا ترجمان لگتا ہے۔

چاک جب لفظوں کے سینے ہوگئے
اپنے آنسو بھی نگینے ہوگئے

آؤ دو پل زندگی سے پیار کی باتیں کریں
پھر کسی آنگن کسی دیوار کی باتیں کریں

☆☆☆

قلب میں گر حوصلہ ہے جا کے جہلم روک دو
پھر کسی سرحد کسی تلوار کی باتیں کریں

اور جب وہ ان سچائیوں کی بات کرتے ہیں تو بالکل جہلم کے شفاف پانی کی طرح....

خوشبوؤں کے شہر سے کچھ بھی نہ لے پائے گا وہ
آشیاں میرا اجلا کر بس دھواں لے جائے گا

☆☆☆

میرے بچے کے تصور میں نہیں پریوں کا خواب
وہ وراثت میں میری اک کہکشاں لے جائے گا

☆☆☆

سبھی قبریں کشادہ ہو چکی ہیں
زمیں اب تنگ ہوتی جا رہی ہے

☆☆☆

زاہد کو منافقانہ اور مصلحت آمیز گفتگو پسند نہیں۔ وہ سچائی اور حق گوئی پر یقین رکھتے ہیں

ہم نے شرافتوں میں سمندر بھی پی لئے
وہ اک ندی کو روک کر مغرور ہو گیا

☆☆☆

جو پھول بیچتا رہا اپنی دکان پر

چھالے پڑے ہوئے ہیں اُسی کی زبان پر

☆☆☆

وہ صوفیانہ جذبات اور ہجر و وصال کی پر ہوس دنیا سے دور رہنا چاہتے ہیں اور ایک ایسی دنیا بنانا چاہتے ہیں جس میں پاکیزگی کا نور اور سکون ہو۔

بے گانے موسموں میں سنورنا نہیں کبھی

بکھرے ہوئے دلوں میں نکھرنا نہیں کبھی

جن کے سمندروں میں ڈبونے کا فن نہ ہو

اُن پانیوں میں ہم کو اُترنا نہیں کبھی

☆☆☆

غیروں کا آسمان ہے کیا آزمایئے

اپنی زمیں پہ دست دعا بن کے چھایئے

دور حاضر کی غفلت، تباہ کن بھی ہوسکتی ہے۔ اس احساس کو پیش نظر رکھتے ہوئے۔ان کی آزاد نظم ''اب یہ شہر بھی افسانہ'' ہے۔زاہد مختار صاحب کی شاعری جذبات کے فکر کی بھی شاعری ہے اور بے ساختگی ان کی پہچان ہے۔

سلگتے چنار'' زاہد مختار کا وہ کارنامہ ہے جسے ادبی حلقوں میں مدتوں یاد کیا جائے گا۔

☆☆☆

(فروری ۲۰۰۶ء)

جہلم اور چنار....

محمد حسین طائرؔ: قلمکار :اسلام آباد کشمیر

زاہد مختار کے شعری مجموعہ ''سلگتے چنار'' میں ''یادوں کے فانوس'' پڑھ کر پتہ چلتا ہے کہ شوخیوں کا مجسمہ زاہد بڑا احساس ہے، بہت دکھی ہے۔ زمانے کی بے رخی نے اُسے بہت کچھ دیا ہے، رنگ، برش، قلم، رعنائیِ خیال، پاکیزگیِ بیان، دردِ انسانیت، کیا نہیں ہے اس کے پاس۔۔۔۔۔ لیکن پھر بھی خود کو تہی دامن ہی سمجھتا ہے.....دورانِ گفتگو پھلجڑیاں بکھیرنا اسکی فطرت ثانیہ ہے۔ میری نگاہ میں زاہدؔ کے اندر فنونِ لطیفہ کے کئی مدوجزر ٹھاٹھیں مار رہے ہیں۔ زیرِ تبصرہ افسانوی مجموعہ ''جہلم کا تیسرا کنارہ'' میں شامل کئی افسانوں مثلاً ''سورج کا پہلا اندھیرا'' ''لمحے کا سفر'' ''باسی روٹی'' ''پُلِ صراط'' جہلم کا تیسرا کنارا'' وغیرہ کا تانا بانا کشمیر کے عصرِ نو کے حالات و معاملات سے بُنا گیا ہے۔ کہانی اور افسانے کا فرق سمجھاتے ہوئے نیاز فتح پوریؔ نے کیا خوب لکھا ہے۔

''کہانی کی خصوصیت یہ ہے کہ سننے والے کو نیند آجائے اور افسانے کی

خصوصیت یہ ہے کہ سوئے ہوئے کو چونکا دے۔ پھر اس چونکا دینے کے طریقے مختلف ہوا کرتے ہیں، کوئی سلیقہ و تمیز سے چونکاتا ہے تو کوئی پوہڑ پن اور بدتمیزی سے''

اس مجموعے میں شامل ''جہلم کا تیسرا کنارا'' عنوان کے لحاظ سے ہی تجسس خیز اور چونکا دینے والا ہے۔ پورا افسانہ پڑھ کر قاری کے ذہن میں تیسرے کنارے'' کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ اُس کے ذہن میں ایک لمحہ فکر یہ پیدا ہو جاتا ہے اور وہ چونک پڑتا ہے۔

افسانہ ''جہلم کا تیسرا کنارا'' کا پس منظر جہلم کے کناروں اور ڈل میں مقیم غریب لوگ ہیں۔ اس میں ایک غریب اور سادہ اور معصوم کنبے کی تصویر کشی کی گئی ہے جو جہلم کے کنارے ایک بوسیدہ ہاوس بوٹ میں کئی دہائیوں سے مقیم ہیں ایک رات اچانک سیلاب کی زد میں آجاتا ہے۔ افراد خانہ معجزاتی طور بچ تو جاتے ہیں لیکن برسوں سے مرمت کی دہائی دے رہا اُن کا ہاوس بوٹ جہلم کی طغیانی میں دریا بُرد ہو جاتا ہے۔ بے گھر ہونے کے بعد اُنہیں جہلم کے دوسرے کنارے پر رحمان ملہ کے ہاوس بوٹ میں سر چھپانے کی جگہ تو ملتی ہے پر اب اُن کی زندگی پرائے چھت تلے آکر بے رنگ و نکہت ہو جاتی ہے۔

کردار نگاری کے لحاظ سے یہ ایک قابل قدر افسانہ ہے۔ افسانے کے بیادی کردار سونہ جو کے جذبات، احساسات، دلی صدمات اور ذہنی پریشانیوں کی جاندار الفاظ میں عکاسی کرنے سے افسانے کی تعمیر میں جان پڑ چکی ہے۔ ساتھ ہی کشمیر کے سماجی، انتظامی اور سیاسی ماحول کی بے حسی اور خود غرضی کو بھی کرداروں کی زبان میں اشاریت کے فنی پرایے میں بیان کیا گیا ہے۔ حکومت وقت کی بے حسی کی چند مثالیں کرداروں کی

زبان میں ملاحظہ فرمائیں۔

''.........رحمان ملہ نے اُس رات اپنے کمرے میں بُلا کر اُسکے مستقبل کے بارے میں پوچھا تو وہ کچھ کہہ نہ پایا ''سونہ جو...اس طرح خاموش رہنے سے اگر انسان کی مصیبتیں ختم ہوتیں تو ان دو ہفتوں میں حکومت نے تمہاری کوئی مدد کی ہوتی''

''نہیں...اس کے لئے مختار کئی دنوں سے وزیر وزارت کے چکر لگا رہا ہے۔ انشاء اللہ کچھ دنوں تک ہمیں ایک ہاوس بوٹ بنانے کے لئے کچھ لکڑی اور نقدی ملنے والی ہے''

''سونہ جو...خود کچھ سوچو۔ یہ حکومتیں ہم غریبوں کو صرف ووٹ کے دن یاد رکھتی ہیں''

غرض کرداروں کی حرکات وسکنات اور زبان و بیان سے یہ افسانہ آگے بڑھ کر افسانہ نگار کے مقصد کو واضح کرتا ہے۔ اِن کرداروں کی زبان بڑی عام فہم ہے۔ وہی زبان جو ہمارے ہاں متوسط اور غریب طبقوں کے لوگ بولتے ہیں۔ ان کی باتوں کو سن کر ایسا لگتا ہے کہ زاہد نے ان کرداروں کے دکھوں کو قریب سے دیکھ کر اور ان کے دلوں کو ٹٹول کر یہ افسانہ لکھا ہے۔ سونہ جو، اُس کی اہلیہ راجہ، جوان بیٹی محبوبہ اور باپ کے پیشہ (سیاحوں کو شکارے میں ڈل کی سیر کروانا) سے متنفر نوجوان بیٹا مختار وہ کردار ہیں جن کے ذہنی و قلبی حالات سے افسانہ نگار بالکل مانوس نظر آتا ہے اور یہ افسانے کی خوبی ہے۔

پرائی چھت کے انتہائی ناسازگار حالات میں جب مختار شال پھیری کرنے کے لئے کلکتہ کا رخ کرتا ہے تو سونہ جو کو ''اپنی بوسیدہ ٹوپی میں ہزروں شگاف نظر آتے ہیں'' یوں بیٹے کے دور چلے جانے اور حالات کی دیگر ستم ظریفیوں سے جسم و جان اور جواں سال بیٹی کی مدد سے گھاس پھوس اور لکڑیاں جمع کر کے جہلم کے دوسرے کنارے پر ایک

جھونپڑا تعمیر کرتے ہیں۔ ڈیڑھ سال بعد راجہ بی اپنے گھر میں شام کا کھانا پروستے ہوئے کہتی ہے ''کاش آج مختار بھی ہمارے پاس ہوتا۔ آج ڈیڑھ سال کے بعد اپنے گھر میں کھانا پروس رہی ہوں۔ اتنے دنوں ایسا لگ رہا تھا جیسے سب کچھ کسی نے بھیک میں دیا ہو''۔

جہد پیہم لئے، چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے آشنا، رنج وغم میں ڈوبے۔ انسانی نفسیات کے حقیقی رنگوں میں رنگے ان کرداروں کو دیکھ کر قاری جہلم کے کناروں پر بکھرے پڑے انسانی مسائل، تعلقات اور سماجی وسیاسی برتاو کے طور طریقوں سے بخوبی واقف ہوتے ہیں۔ غرض زاہد نے اس افسانے کی تشکیل وتعمیر کا کام جہلم کے کناروں پر بکھری ان ہی ٹھوس حقیقتوں Concrete reality اور کرداروں کے نفسیاتی تجزیے سے انجام دیا ہے۔

افسانے کے منطقی انجام میں میونسپل اہلکاروں کی موجودگی میں ڈوزر سے جھونپڑا مسمار کرنے کا منظر دکھایا گیا ہے اور یوں ایک بار پھر سے بے گھر ہوکر سونہ جو اپنا دماغی توازن کھو بیٹھتا ہے اور جہلم کے کسی تیسرے کنارے کو ڈھونڈنے کی بات کرتا ہے جہاں اُس کے اہل خانہ کے لئے ''گھر نہ سہی قبریں تو بن سکیں گی''

زاہد کے ایک اور افسانے ''سورج کا پہلا اندھیرا'' کا تار پور منظر نگاری کے سہارے بُنا گیا ہے۔ اس میں ایک نہیں بلکہ کئی واقعات اور مناظر ایک دوسرے سے گتھے ہوئے ہیں۔

پہلے منظر میں خوشی سے جھومتا ہوا چہرا بادام واری کی چاہ میں پہاڑی کی بلندیوں کو عبور کرا ہوا جب آگے بڑھتا ہے تو اُسے بادام واری کی جگہ پیڑ پودوں سے خالی زمین پر

بادام واری کے کھنڈرات نظر آتے ہیں جہاں اگنی ریکھا کی ایک حصار ہے اور جس کے آگے بڑھنا منع ہے۔اس حصار کے آس پاس راون رہتا ہے۔

دوسرے منظر میں کوہ ماراں کے دامن میں واقع روز بروز سکڑتے سمٹتے جھیل ڈل کے پانیوں میں بہتے انسانی لہو کی تصویر کے ساتھ ساتھ ڈل کے آس پاس پھیلی اراضی پر روز بروز وسیع وعریض ہوتے ہوئے قبرستانوں کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔اس کے ساتھ ہی جُڑے منظر میں دکھایا گیا ہے کہ جھیلوں اور آبشاروں کی سرزمین پر لوگ پانی کو ترس رہے ہیں۔منرل واٹر کا چلن عام ہو رہا ہے۔پانی کے شفاف منبوں پر''راون'' کا پہرہ ہے۔اسکے بعد والے منظر میں بازار جاتے ہوئے شخص کو دکھایا گیا ہے جسے بار بار اپنی جیب سے اپنا نقلی و بے جان چہرہ نکال کر اپنے اصلی چہرے کی شناخت کروانی پڑتی ہے۔یونہی افسانے کے آخر میں لیڈر کے جھوٹے بھاشن اور خاک وخون سے لبریز آفات سماوی کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔الغرض افسانہ نگار نے عصری حالات اور عہد حاضر کے مخصوص لفظیات (Diction) کی مدد سے ہمارے آس پاس بکھری ہوئی ٹھوس حقیقت (Concrete Reality) کی تصویر کشی کی ہے۔یوں افسانہ نویس نے آج کے عہد کے زندہ و متحرک الفاظ اور تواریخی اہمیت کے حامل الفاظ کے باہمی ربط سے وادئ گل کے موجودہ دور ابتلا کی صحیح تصویر پیش کی ہے۔ہمارے عہد کے زندہ متحرک الفاظ سے میری مراد اس افسانے میں استعمال کئے گئے الفاظ مثلاً''ٹی وی سکرین''''چینل''''رموٹ کنٹرول''جنریٹر''''کیبل نیٹ ورک''''سگنل''''زوم آوٹ''''ٹیلی کاسٹ''''ڈی این اے ٹیسٹ''منرل واٹر''وغیرہ سے ہے۔اسی طرح تواریخی اہمیت کے حامل الفاظ سے میری مراد اس افسانے کے لفظیات''بادام واری''''اگنی ریکھا''''

راون'' وغیرہ سے ہے۔ یہ تمام الفاظ اپنے اندر علائم و پیکر لئے افسانہ نگار کے نقطہ نظر کو واضح کرنے کے ساتھ ساتھ افسانے کو اسکے منطقی انجام تک پہنچانے میں بڑے فعال ثابت ہوئے ہیں۔ یوں اس افسانے کی منظر نگاری اور تخلیقی زبان کے صحیح برتاؤ کی وجہ سے قارئین اسے پسند فرمائینگے۔ ایسے افسانوں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے ان میں زمانے کے حالات اور سماجی روح چھپی ہوتی ہے اور یوں یہ اپنی تاریخ کے ترجمان ہوتے ہیں۔

زاہدؔ کے لکھے ہوئے افسانوں کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ اُس کی افسانہ نگاری کسی خاص رجحان (مثلاً منٹوؔ کی جنسیت یا کرشن چندر کی روحانیت وغیرہ) کے دائرے میں مقید نہیں۔ ادب اور زندگی سے متعلق ان کا رویہ، اُن کا فن سیمابی صورت مین جلوہ گر ہے۔ جہاں تک اسلوب یا طرز ادا کا تعلق ہے۔ زاہدؔ اپنی بات اپنے طریقے سے کہنے کا ہُنر رکھتا ہے۔ وہ اپنے ادبی ترکے سے واقف ہے اور عہد حاضر کے مزاج اور سماجی حالات سے پوری طرح آگاہ ہے۔ وہ موضوع کے عین مطابق اپنا اسلوب تعمیر کرتا ہے۔☆☆

(۱۰ر نومبر ۲۰۰۸ء)

جہلم کا تیسرا کنارہ

عالمی سہارا : نئی دہلی

افسانوی مجموعے ''جہلم کا تیسرا کنارہ'' کے آخر میں مصنف نے اپنے فن کے بارے میں کہا ہے کہ ''مجھے اعتراف ہے کہ میں نہ افسانہ نگار ہوں، نہ شاعر، نہ ڈرامہ نویس''، لیکن اپنے افسانوں کے مجموعے میں انہوں نے پُر اثر انداز میں زندگی کے مختلف پہلوؤں کو سمویا ہے۔

افسانے ''سورج کا پہلا اندھیرا'' میں مورخ بن کر جدید دور کے ایسے شخص کو دکھایا ہے جس کی زندگی ٹیلی ویژن سکرین پہ نظر آتی ہے۔ ٹیلی ویژن سکرین اُس کی زندگی کا محور و مرکز ہے۔ ٹیلی ویژن پر اُس کی زندگی میں کرب اور کامرانی کے رنگ نظر آتے ہیں ہے۔

ایک اور افسانہ ''کتبہ'' میں ایک ایسے شخص کے کرب کو پیش کیا گیا ہے جو اپنی محبوبہ کی راہ دیکھتے دیکھتے موت کی آغوش میں سما جاتا ہے اور ایک طویل عرصے بعد جب اُس کی موت کی خبر محبوبہ کو ہوتی ہے تو وہ چند پھول لیکر اُس کی قبر پر جاتی ہے تو وہاں اُسکے عاشق کی قبر چیخ چیخ کر اُس سے واپس جانے کو کہتی ہے۔ اس مختصر تخلیق میں مصنف نے

پراثر انداز میں ایک ناکام عاشق کے کرب کو آگاہ کیا ہے۔

''آنگن'' میں ایک ایسے جوڑے کی زندگی کو دکھایا گیا ہے جس کی تین بیٹیاں ہیں اور ان تینوں کو زندگی کے نشیب و فراز دکھائے گئے ہیں اور ان تینوں بیٹیوں کی پُرکیف زندگی کس طرح بدلتے وقت کی شکار ہوتی ہے اور انجام کو پہنچتی ہے۔ یہ افسانہ قدرے طویل ہے..........

''شرپسند'' ایک مختصر کہانی میں سیاستدان طبقے کی اصل حثییت کو بہتر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ جبکہ ایک اور کہانی ''وفا'' میں سرکس کے ایک ایسے لوین ماسٹر (Lion Master) کی کہانی بیان کی گئی ہے جو وحشی شیر کو سدھا تو لیتا ہے لیکن سرکس کے مالک سے مار کھا کر زخموں کی وجہ سے موت کی دعا مانگتا ہے اور یوں اُس کا اپنا سدھایا ہوا شیر اپنی وفاداری کے طفیل اُسے درد سے نجات دلاتا ہے۔ یہ کہانی انسان کے وحشی پن اور جانور کی انسانیت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

''لمحے کا سفر'' میں سماجی زندگی کے کورپشن اور سیاسی لیڈروں کی بے حسی کی عکاسی کی گئی ہے کہ کس طرح سیاستدان اپنے فتنوں سے عام انسان کو دست و گریباں کر دیتے ہیں۔

کتاب کی کمپوزنگ اور طباعت اچھی ہے اور سرورق خوبصورت۔



(۲۵رفروری ۲۰۰۶)

خوبصورتی کا سنہری کنارا

طارق شاہین
مدیرِ اعلیٰ ''شاخیں'' اندور

وادیٔ کشمیر کی نئی نسل جو اردو ادب میں اپنی پہچان بنانے میں کوشاں ہے۔ بلا شُبہ اس میں ایک نام ایسا بھی ہے جو قریب قریب نہ صرف اپنی پہچان بنا چکا ہے بلکہ اس فنکار نے وادی سے نکل کر شعر و ادب سے تعلق رکھنے والوں کو نہ صرف پوری طرح اپنی طرف متوجہ کیا ہے بلکہ اپنی شناخت بھی قائم کی ہے۔ اور یہ نام ہے زاہد مختار کا

''جہلم کا تیسرا کنارا'' اُن کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے جو ۲۹ افسانوں پر مشتمل ہے۔ ان کے افسانوں کو پڑھنے کے بعد میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ زاہد مختار کی فکر اور اظہار بیان میں انفرادیت ہے بلکہ ایک مثبت سوچ اور فکر میں گہرائی بھی ہے۔ زاہد مختار نے بہت کم وقفے میں بہت کچھ اردو ادب کو دینے کی بھرپور کوشش کی ہے اور وہ بھی ایک کامیاب کوشش۔ زاہد مختار، افسانہ نگار، شاعر، صحافی اور ڈرامہ نگار ہونے کے علاوہ فکشن نگاری میں ٹیلی فلم اور ڈرامہ سیریل کے بھی حاتم ہیں۔ اس افسانوی

مجموعے کے علاوہ اُن کے تین سے زائد شعری مجموعے اور ایک ناول بھی شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ ساتھ ہی وادی سے شایع ہونے والے ہفت روزہ ''المختار'' ان کے صحافتی شعور کا مثبت ثبوت پیش کرتا ہے۔ ان کی ڈیڑھ سو سے زائد غزلیں اور بے شمار افسانے برصغیر کے موقر رسائل میں شائع ہو چکے ہیں اور خدا کا شکر ہے کہ یہ عمل آج بھی جاری ہے۔

زیرنظر افسانوی مجموعے کی نثر نگاری میں نہ صرف فکری اور کائناتی مسائل کے چراغ روشن کئے ہیں بلہ اپنے باطن کی گہرائیوں میں غوطہ زن ہو کر تجزیاتی طور پر اپنے انفرادی اور ذاتی ردعمل کو پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی آپ کے ذہن وفکر کے روشن مناظر ان کے افسانوں میں ستاروں کی طرح چمکتے ہیں۔ زاہد مختار نے اپنی تخلیقات کے صاف وشفاف دھاروں سے اپنے تخلیقی سفر کو جاری رکھا۔

''جہلم کا تیسرا کنارا'' اس لئے بھی کامیاب کوششوں میں شمار کی جاسکتی ہے کہ ان افسانوں کی زبان عوامی ہے اور عوامی مسائل ان کی خوبی ہے۔ ''باسی روٹی'' ''میری کہانی کا افسانہ'' ''ایک ادھوری کہانی'' ''سحر ہونے تک اور ''کسوٹی'' ایسے افسانے ہیں جنہیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ افسانوں کے شوقین اور پسند کرنے والے حضرات کے لئے ''جہلم کا تیسرا کنارا'' ایک بیش قیمت تحفہ ہے۔ عمدہ طباعت، بے داغ کمپوزنگ، اور بہترین کاغذ نے اسے دیدہ زیبی اور خوبصورتی کا سنہری کنارہ بنا دیا ہے۔



........زاہد مختار کا شعری مجموعہ ''سلگتے چنار'' ان کی ایک اور صلاحیت کا بھرپور احساس دلاتی ہے۔ یعنی اس شاعر نے اپنے شعروں میں زمین پر بکھرے ہوئے مسائل پر خصوصی

توجہ دی تھی۔ ان کی نظمیں ذہین اور بالغ فنکاری کا گویا اظہار ہیں۔ اگرچہ ان کی ادبی عمر زیادہ نہیں ہے لیکن وہ جلتے ہوئے عصری و انسانی کو بہتر طریقے سے نظم کرنے کے ہنر پر قدرت رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری میں فکری، تجرباتی، خیالات کا بہاو، آبشاروں کی طرح رواں دواں ہے۔ وہ بات سے بات نکالنے کے فن سے واقفیت رکھتے ہیں۔ ان کی غزل اکثر و بیشتر نئے اسلوب کے ساتھ ساتھ چونکا دینے والے تیور لئے ہوتے ہیں۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہ جدت اور نئے پن کی تلاش میں مصروف عمل نظر آتے ہیں۔ اور یہی عمل انہیں اپنے ہم عصروں سے الگ اور انفرادیت کا درجہ عطا کرتا ہے۔

''سلگتے چنار'' مجموعی طور پر اچھا شعری مجموعہ ہے جو پڑھنے کی اپیل کرتا ہے۔ اس مجموعہ کا پہلا شعر میری بات کی تائید کرتا ہے

چاک جب لفظوں کے سینے ہو گئے
اپنے آنسو بھی نگینے ہو گئے

(اپریل ۲۰۰۷)

شاعری ''انقلابی رنگ'' لئے

خورشید کاظمی، جموں

میں بلواسطہ یا بلا واسطہ، کسی اخبار یا رسالے کی وساطت سے کشمیر کے بہت سارے شاعروں، قلمکاروں اور ادبی حلقے سے تعلق رکھنے والے افراد سے متعارف ہوا ہوں لیکن شومئ قسمت کہ میں نے نہ ہی خود کبھی زاہد مختار کا نام سنا تھا اور نہ ہی کسی ادبی محفل میں کسی نے اُس کا ذکر ہی کیا تھا جب تک کہ میں نے اُسے سال ۲۰۰۸ء کے اوائل میں کے۔ایل سہگل ہال جموں میں کلچرل اکادمی کی جانب سے منعقدہ ایک مشاعرے میں نہ سنا۔

میں اُس غزل سے بے حد متاثر ہوا جو اس خوبرو اور دلکش شخصیت نے اپنی مترنم آواز میں سنا کر مدعو سامعین سے داد تحسین حاصل کی۔ سٹیج سے رخصت ہونے سے قبل زاہدؔ نے طنزیہ لیکن نہایت ہی شایستہ لفظوں میں اردو ادب کے پرانے ''سورماؤں'' سے مخاطب ہو کر اُن سے التجا کی کہ اب وہ گوشہ نشیں ہو کر نئے ادبی کارواں کو نہ صرف سٹیج پہ آنے کا موقع فراہم کریں بلکہ اُن کی رہبری فرما کے اُنہیں اپنے آپ میں خود اعتمادی پیدا کرنے کا راستہ بھی فراہم کریں۔ یوں میں نے اپنے آپ کو زاہد سے متعارف کرایا اور اُن کی غزل اور اُن کے لفظوں کو سراہا۔

تو یہ تھا میرا پہلا موقع جب میں کشمیر کے اس ''انقلابی'' شاعر سے ملا۔

اُنہوں نے مجھے اپنی ایک تصنیف ''سلگتے چنار'' تحفتاً پیش کی اور میں نے پہلی ہی ملاقات میں یہ اندازہ لگایا کہ اس شخص نے اپنی زندگی میں کافی اُتار چڑھاو دیکھے ہیں جن کا اعتراف اُنہوں نے زیرتبصرہ کتاب کے اُس باب میں بھی کیا ہے جس میں اُنہوں نے اپنی ''آپ بیتی'' بیان کرتے ہوئے یہ بات بھی ضبط تحریر میں لائی ہے کہ اُنہوں نے اپنی زندگی میں بہت سارے مدو جزر دیکھنے کے ساتھ ساتھ ناانصافی کے وہ نظارے بھی دیکھے ہیں جنہیں محسوس کرتے ہوئے وہ سرکشی پہ ہی آمادہ نہیں ہوئے ہیں بلکہ انہوں نے اس باب میں اس عزم کو بھی دہرایا ہے کہ وہ اس ناانصافی کیخلاف اپنے انداز سے ہمیشہ برسر پیکار رہینگے۔

اس کتاب کی ورق گردانی کے دوران یہ حقیقت بھی منکشف ہو جاتی ہے کہ زاہد اپنی سرکشی کے زیر اثر دو بار سرکاری نوکری سے استعفیٰ دے چکے ہیں۔ اس دوران اُنہوں نے غم دوراں کے مرحلے طے کرتے ہوئے روزگار کمانے کے کئی ایک وسائل اپنائے اور یوں اُنہوں نے اپنی ذات کے ہمہ جہت عکس جلوہ گر کئے ہیں اور میں ایسی شخصیت کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔

اُنکے شعری اصناف، غزل اور نظم دونوں اس بات کے شاہد ہیں کہ انہوں نے زندگی اور زندگی سے جڑے مختلف کرداروں کو اتنی باریک بینی سے دیکھا ہے کہ وہ خود ایک حساس ذہن و دل کے مالک بن گئے ہیں۔ وہ اُن عمر رسیدہ ادبا کے تئیں تنقیدی جذبہ تو رکھتے ہیں جو نئی پود کو آگے آنے کا موقع فراہم نہیں کرتے لیکن خود زاہد پورے اعتماد کے ساتھ یوں رقمطراز ہے:

تم کہانی کے سبھی کردار بن کر جان لو ☆ ایک دن زاہدؔ اُبھر کر داستاں لے جائے گا

کرگسوں کا یہ دور ہے زاہدؔ ☆ کیوں کبوتر چلا اُڑانے کو

زندگی کے تجربات اور ماحول کی تلخیوں سے نبرد آزما ہوکر زاہدؔ اپنے قلم کو یوں بھی .... جنبش دیتا ہے:

لہو کا اک سمندر پی چکا ہوں ☆ میں ہر اک زخم دل کا سی چکا ہوں

مہکا سکی نہ گھر کو بھی کوئی اگر بتی ☆ جذبہ دلوں سے کب کا بہت دور ہو گیا

اگر چہ زاہدؔ نے اپنی تحریروں میں کہیں پہ بھی اس بات کا اعتراف نہیں کیا ہے کہ وہ ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت یا ایسے کسی ازم سے متاثر ہیں لیکن اُن کے کچھ اشعار خود اس بات کے آئینہ دار ہیں:

کرنوں نے اک شعر کہا تھا رات نے دی تھی داد بہت
چاند نے چپکے چپکے گا کر سورج کو اُکسایا تھا

پہاڑوں سے صدا اِک آ رہی ہے ☆ کبوتر، چیل کا لی کھا رہی ہے

زاہدؔ نے وادی کشمیر کو نا مساعد حالات کے دوران لہو میں تر ہوتے دیکھا ہے اور ایک حساس شاعر ہونے کے ناطے اُنہوں نے اس ماحول سے لاتعلق نہ رہتے ہوئے اپنے جذبات کو یوں زبان عطا کی ہے:

ہر اِک آنکھ میں نیلا پتھر، اپنا شہر پرایا سا ☆ گلی گلی میں ہر سو بنکر، اپنا شہر پرایا سا

تبسُم کو لہو سے دھو گیا ہے ☆ زمیں میں کون خنجر بو گیا ہے

مخملی دھرتی پہ ڈالی کس نے راکھ ☆ آنکھ سے اوجھل دفینے ہو گئے

پہلے رہتے تھے سبھی کچے مکانوں میں مگر ☆ اب تو ٹوٹی شاخ پہ سب کا بسیرا ہو گیا

ماں کی پیاری گود میں سویا تھا جو کل رات کو ☆ موت کی آغوش میں اُس کا سویرا ہو گیا

روٹھی ہوئی ہوائیں ہیں، بارش نہ آئے گی ☆ چنگاریوں کا شہر ہے دامن بچایئے

یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ ایک قلمکار کے تجربات یا اُسکی زندگی کے حادثات اُس پر اپنی ایک ایسی چھاپ چھوڑ جاتے ہیں کہ اُن کا عکس کسی نہ کسی انداز سے اُس کی تحریروں میں جھلکتا ہے اور زاہدؔ کو بھی فطرتاً اس سے مبرا قرار نہیں دیا جاسکتا۔ حالانکہ اُن کی غزلوں کا مطالعہ کرنے سے یہ بات پورے وثوق سے نہیں کہی جاسکتی لیکن اُن کی کچھ نظمیں اُن کے نہاں خانہ دل کو کچھ کچھ عیاں کر دیتی ہیں۔ جن میں تیرے پیروں کے اُن آبلوں کی قسم، ....آج بھی کیا میری یادوں میں رہا کرتی ہو، .....سحر ہونے تک، ....میرا قصہ بھی قصہ ہی رہ جائے گا، ....تیری خوشبو میں بسے خط میں جلاؤں کیسے اور میں ترے ساتھ چلونگا تیرا آنچل بن کر... نظمیں ہمیں اس جواں سال شاعر کی اُن کیفیات کے عالم میں پہنچا دیتی ہیں جن سے یہ شاعر کبھی گزرا ہے۔

اور........میرا یہ ماننا ہے کہ اگر ایسا کچھ نہ ہوا ہوتا تو ہمیں زاہد کا یہ دل چھو لینے والا کلام پڑھنے کو نہیں ملتا.. میں زاہدؔ کے اس شعر سے ہی قصہ مختصر کئے دیتا ہوں

کبھی زاہدؔ کسی کے دل میں بھی تھا
یہ قصہ اب پرانا ہو گیا ہے

☆☆☆

(انگریزی سے)

(کشمیر ٹائمز: ۱۸ر نومبر ۲۰۰۸ء)

عمر مجید کی ایک اور آرا

جان محمد آزاد کی مرتب کردہ کتاب

''جموں کشمیر کے اردو مصنفین'' کے تناظر میں

جان محمد آزاد نے تمہارے ساتھ بڑی ناانصافی کی ہے، ظُلم کیا ہے۔ تمہارے دل کو ایک ایسی ٹھیس پہنچائی ہوگی جس کا کرب صرف میں محسوس کرسکتا ہوں۔ تاریخ اس طرح مسخ کی جاتی ہے..... جان محمد آزاد میرا دوست ہے، بخدا میں نے ہمیشہ اپنی محبت کے پھول (مہکتے ہوئے) اُس کے قدموں میں نچھاور کیئے ہیں۔ میں کسی دوست یا رشتہ دار کو آزمانے کی غلطی نہیں کرتا.....

تیری مست آنکھوں کا بھرم رکھوں گا　　　　ہوش بھی آیا تو کہوں گا مجھے ہوش نہیں

۴۹۴ صفحات پر مشتمل (جان محمد آزاد) کی کتاب میں تم ایک واحد شخص (ادیب) ہو جسے بے رحمانہ ناانصافی، ظُلم اور کافرانہ ضرب کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ اس کتاب میں محمد یوسف ٹینگ کے بیٹے شہنواز ٹینگ کا خوبصورت الفاظ میں ذکرِ جمیل کیا گیا ہے جس نے زندگی بھر صرف ایک معمولی سا مضمون لکھا ہے۔ جب کہ عبدالرحمٰن آزاد، حسن ساہو، محی الدین شاہ، ظفر احمد، آنند لہر، راجہ نذر بونیاری، دیپک بُدکی جو گذشتہ چالیس سال سے اُردو زبان و ادب کی بے لوث خدمات سرانجام دے رہے ہیں کا بھولے سے بھی ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ کشتواڑ ہمارے دل کا ٹکڑا نہیں؟ کیا وہاں ایک بھی اُردو کا متوالا نہیں۔ عشرت کشمیری کون تھا؟ ...نہیں صاحب، یہ کتاب نہیں ایک بھونڈا مذاق ہے جس کے لئے تاریخ جان محمد آزاد کو کبھی معاف نہیں کرے گی۔ اصل میں جان

محمد آزاد نے خونِ جگر نہیں جلایا ہے۔ عبدالاحد آزاد، محمد حسین کی طرح اس بحرِ بیکراں میں تیرتے تیرتے ہاتھ پاؤں کو شل نہیں کیا ہے بلکہ اپنے شاندار ڈرائنگ روم میں گاؤ تکیہ سے ٹیک لگا کر منہ میں بہترین کوالٹی کی کنگ سایز سگریٹ اور گرین لیبل چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے یہ کتاب لکھی ہے۔

تمہارے اس گنہگار بھائی کے بیس سے زائد اُردو ڈرامے باضابطہ طور ریڈیو کشمیر سرینگر، ممبئی اور بھوپال سے نشر ہوئے ہیں، کتاب میں کوئی ذکر نہیں۔ کیا مجھے گلہ نہیں کرنا چاہئے... ''آپ ادبی دنیا سے کنارہ کش ہو گئے ہیں'' تاریخ اس طرح بگاڑی جاتی ہے۔ جان محمد آزاد نے جب یہ جملہ لکھا تب آپ بفضل ربی زندہ تھے اور ادب کی دنیا میں ایک روشن ستارے کی مانند چمک رہے تھے۔ میں جان محمد آزاد سے متعدد بار کہہ چکا ہوں کہ وہ جلد سے جلد ''جموں و کشمیر'' کے اردو مصنفین کا تصحیح شدہ ایڈیشن شائع کرنے کی تگ و دو شروع کریں اور عبدالاحد آزاد اور محمد حسن آزاد کے نقش قدم پر چل کر محنت و مشقت اور پوری دیانتداری اور خلوص دل کے ساتھ کام کریں اور ایک سچے اور ایماندار محقق کا ثبوت فراہم کرے۔ کتاب میں خود اپنے اوپر (جو کتاب کا سب سے طویل مضمون ہے) کو حذف کرے۔ محمد حسین آزاد نے جس زمانے میں ''آب حیات'' لکھی اُس زمانے میں وہ اپنے فن کا لوہا منوا چکے تھے۔ عبدالاحد آزاد نے جس زمانے میں ''کشمیری زبان اور شاعری'' قلمبند کی اُس زمانے میں وہ شہرت کے بام عروج پر پہنچ چکے تھے۔ جان محمد آزاد بحثیت اردو مصنف (حیات اور کارنامے) یہ کام جان محمد آزاد کو عمر مجید یا زاہد مختار پر چھوڑ دینا چاہئے۔ کیوں؟ ☆☆

☆☆ .... ہمارے کشمیر میں جہاں ادبی لحاظ سے اشاعتی دنیا میں ایک فقدان سا محسوس ہوتا ہے۔ اُن حالات میں بھی اکا دکا شایع ہونے والے ادبی رسائل میں کچھ نئی آوازوں کو کیوں شامل نہیں کیا جاتا لیکن اب شاید یہ روش بدلتی ہوئی محسوس ہو رہی ہے۔ کچھ نئی جہتیں، نئے نام اور نئی آوازیں اس بات کا عندیہ دے رہی ہیں کہ ادبی سرگم میں یہ نئے سُر ایک نئے دلکش گیت کو سجانے میں محو ہیں۔ اگر اُنہیں سرپرستی حاصل رہی تو....... نئی آوازوں کی حوصلہ افزائی کا یہ سلسلہ اہم بھی ہے ورنہ کل کا مورخ یہی لکھے گا کہ اکیسویں صدی میں کشمیر کا اردو ادب چند خانوں میں بٹا تھا اور اُن خانوں میں بھی چند ہی چہرے نظر آتے تھے۔ حالانکہ آپ کو اس بات کا مشاہدہ ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ کئی ایسے شہہ پارے قلم کی نوک پہ لرزاں ہیں جو قرطاس پہ آنے کے لئے مچلتے رہتے ہیں لیکن جب ناموافق ہوائیں اُنہیں اپنی گرمیوں کا اسیر بنا دیتی ہے تو ان لفظوں کے تن بدن میں آگ سی لگ جاتی ہے اور خیال اظہار کی جرأت نہیں کر پاتا۔ ☆☆

نزاکت مختار

جرأت

لفظ لفظ گفتگو

کبھی کبھی تضاد کی آنکھیں بھی
اتفاق کی دعوت دیتی ہوئی نظر آتی ہیں
لیکن
تضاد اور اتفاق کی تفاوت میں
کوئی شئے مشترک ہو تو سہی

ویریندر پٹواری کا اردو افسانوی مجموعہ

ایک ادھوری کہانی

حقانی القاسمی کے آئینے کے روبرو

کہانی اور افسانے کے بارے میں اکثر ناقدین کا یہ خیال ہے کہ کہانیوں کا موضوع دل سے اُبھرتا ہے لیکن دل میں اُترنے کے لئے ان موضوعات کو درد و کرب کی ہزار ہا منزلوں سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ "ایک ادھوری کہانی...." کی کہانیاں جو ابتدائی منظر نگاہوں تلے منعکس کرتی ہیں وہ کچھ یوں ہے:

ایک جنت سے نکلا ہوا آدم..... جو کسی بھی وجہ سے بے وطن ہوا ہوا ایک ادھوری زندگی ہی جی رہا ہے۔ ایک منطقی انجام کا ہی متلاشی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ایک اضطراب اور تذبذب کی کیفیت سے لرزتا ہوا یہی چاہتا ہے کہ اُسکی کہانی مختصر ہی سہی لیکن تشنہ لب نہ ہو۔ اس زندگی کو بھلے ہی ساری آسائشیں میسر کیوں نہ ہوں لیکن وہ سکون کے ایک لمحے کے لئے بے قرار ہی رہتی ہیں اور یوں اس بدنصیب زندگی کی کہانی ادھوری ہی رہ جاتی ہے۔ ایک ایسی ادھوری کہانی جس میں انسان نامکمل لگتا ہے۔ ہر دور میں یہی کچھ ہوا ہے کیونکہ جب جب آدم نے قدرت کے اصولوں سے انحراف کر کے اُن میں ترمیم کرنے کی کوشش کی ہے تو جسمانی اور روحانی ترکیب ہیئت کا سارا نظام درہم برہم ہوا ہے۔ پاؤں ہاتھ بن کر انسان کے شکم کو سیر کرنے کی لاحاصل سعی کرتے ہیں ۔ ہاتھ

آنکھیں بن کر تاریکیوں میں تجلیوں کی اندھی تلاش میں محو ہو جاتے ہیں۔ سر کٹے بدن پہچان سے محروم ہو جاتے ہیں اور اشرف المخلوقات حیوانوں کی بھیڑ میں گُم اور اسی ارتعاش سے آدم کی ارتقا بھی متاثر ہوتی ہے اب بھلے ہی وہ کسی وشوامتر کو تلاش کرتا رہے۔ میں ڈارون کے نظریے کو اسی لئے بھی مسترد کر چکا ہوں کیونکہ ڈارون آدم کو حیوان سے انسان بنتے ہوئے دیکھنے کا دعویٰ کرتا ہے جبکہ میرے خیال میں آدم انسانیت کی قبا اُتار کر حیوانیت کی کھال میں بھی عریاں ہو چکا ہے۔ ڈارون قدروں کو معراج عطا کرنے کی تھیسیس بنا چکا ہے جبکہ انسانی قدریں بتدریج عروج سے زوال کی جانب گامزن ہیں۔

میں ''ادھوری کہانی...'' کے صفحوں میں ابھی بھی تلاش آدمیت کے کرب سے گزر رہا ہوں ۔ مجھے کہانیوں کے نزول سے انحراف نہیں لیکن کہانیوں کے بطن سے جس عجیب الخلقت شئے نے جنم دیا ہے اس نے مجھے تضاد کے گہرے کنوئیں میں دھکیل چکا ہے ایک ہندو یا سکھ کے پیچھے بھاگتا ہوا کتا.... زیتون کے پتے پر سوار ایک سبز پوش..... دستک کا اشتیاق.....رات کے دبیز پردوں میں چھپا ہوا ''وہ'' جسکے چہرے پر گوشت نہیں...آدم کی لاش....سنگ چور جیسا خوبصورت اجنبی..... دشرتھ کی پکار.... انسانی دل رکھنے والا جانور...سنگین رات کی سحر...اور پھر ''حقیقت'' .....مجھے یہ تمام علامتیں ایک ہی نقطہ نگاہ کی ضامن لگیں جبکہ ان افسانوں کے بارے میں حقانی القاسمی کا یہ کہنا ہے کہ یہ افسانے اجتماعی حوالہ بننے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔

میں افسانوں کے بیانیہ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا لیکن حقانی صاحب اُن جزیروں، گاؤں اور گلیوں میں نہیں رہتے جن کی منظر کشی افسانوں کے کینواس پر تخلیق کار

کے برش نے بڑی عرق ریزی سے کی ہے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ میں خود اُن گلیوں کا اسیر ہوں اور میں جانتا ہوں کہ یہاں کا مسئلہ نہ گجرات کے فسادات کا مسئلہ ہے اور نہ ہی بابری مسجد رام جنم بھومی کا قضیہ۔ یہاں امریکی ٹاور اور طالبان کا مقابلہ دکھائی نہیں دیتا اور نہ ہی یہاں آگرہ اور لاہور کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ یہ جہلم کی لہولہوتر کہانی ہے جس کے پانیوں میں فرقہ واریت کا رنگ کبھی چھایا ہی نہیں بلکہ آج بھی اسکے ایک کنارے پر مندر اور دوسرے کنارے پر ایک مسجد آباد ہے۔ یہ وہ دھرتی ہے جہاں میرے ہی قصبے (اننت ناگ) کے شیر باغ علاقے میں صدیوں سے ایک رام مندر، ایک گردوارہ اور داراشکوہ کی تعمیر کردہ ایک مسجد آباد زمین کے ایک ہی ٹکڑے پر اپنی روحانیت کا نور پھیلا رہی ہے۔ یہ اُس شنکر آچاریہ اور سلیمان پہاڑی کی ورق ورق روشن داستان ہے جہاں شردھالو اور زائرین کاندھے سے کاندھا ملا کر آج بھی بلندیاں سر کرتے ہوئے دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہ اُس خوشبو کا افسانہ ہے جو انسانی قدریں بن کر آج بھی دلوں میں مہک رہی ہے اور یہ قدریں دلوں کی امانتیں ہیں اور امانتیں صدیوں بعد ہی سہی حقدار کو ملا کرتی ہیں کیونکہ یہاں مسجد سے گونجنے والی اذان اور مندر سے بجنے والے شنکھ نفرت کا پیغام نہیں سناتے۔ اس تناظر میں حقانی صاحب سے اختلاف کیا جا سکتا ہے یہ کہانیاں فنی اعتبار سے خوبصورت سہی لیکن یہ ایک عہد کی آئینہ ساز نہیں بلکہ ایک عارضہ دور کی شبیہ ہیں۔ مجھے آج بھی ان کہانیوں میں اُس کرشن کی تلاش رہی ہے جو کوروں اور پانڈوں کے یُدھ میں خود کو ہر دو جانب سے کٹتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ نہ جانے مجھے وہ کرشن اس مجموعے کے کسی صفحے پہ نظر کیوں نہیں آیا۔ یا تو میری آنکھوں تلے چھائی ہوئی دھند اتنی گہری ہے کہ مجھے جہلم کی سطح آب پر تیرتی ہوئی لاشوں میں نہ کوئی کورو نظر آ رہا ہے اور نہ

پانڈو یا پھر شاید اُن لاشوں کا ڈی این اے ٹیسٹ ابھی ہونا باقی ہے۔ کیونکہ اُس ٹیسٹ کے بعد ہی تو کہانیاں بدلتی ہیں اور جب کہانیاں بدلتی ہیں تب نئے افسانے جنم لیتے ہیں ۔ یہ کتاب اُن چناروں کے غم میں دو آنسو بہاتی ہوئی ضرور نظر آئی جن چناروں کے سائے تک جلا دئے گئے ہیں۔ ادھوری کہانی پوری ہوسکتی ہے اسکے لئے پیڑوں پر سر اُگانے کے بجائے لفظوں کے سینے میں کشمیریت کو دھڑکنا ہوگا۔

قاری کو دیومالائی کرداروں کی کتنی جانکاری ہے اور کتنی نہیں اس بحث سے قطعہ نظر وہ واقعات و کہاوتوں کے حوالے سے طالب علم ہوتے ہیں اس لئے کرشن، ارجن، وشوامتر، ،موسی ،عیسی ،شیو پاورتی ، رحمان، شیطان کی بھی جانکاری رکھتے ہیں۔ اُنہیں ایک طالب علم ہونے کے ناطے کسی بھی دیومالائی یا اساطیری یا مذہبی کہانی کا ادراک کما حقہ ہوتا ہے اور اس تناظر میں اس افسانوی مجموعے میں شامل تمام کرداروں کی وساطت سے تخلیق کی گئی کہانیوں کے نظریے سے اختلاف بھی کیا جاسکتا ہے کیونکہ ہر قاری کو اختلاف کرنے کا حق ہے۔ کسی قلمکار کا افسانہ صحیفہ آسمانی نہیں کہ میں اُس پہ اعتقاد کی حد تک یقین کر لیا جائے۔ کہانیاں برسوں سے تخلیق ہو رہی ہیں اور برسوں سے ہی ان جیسے لاکھوں کرداروں کو تخلیق کاروں نے اپنے اپنے افسانوں میں اپنی اپنی مرضی کے مطابق ''استعمال'' کیا ہے۔ ایم ایف حسین کے اسی تخلیقی ''جنون'' نے اُسے زبردست تنقید کا نشانہ بھی بنایا ہے۔ لیکن اس سے نہ کاروان فن رُکتا ہے اور نہ تنقید کے حق سے کسی کو محروم کیا جاسکتا ہے۔ ایک ''گھوڑا'' یا ایک ''کتا'' علامت کے طور پر کون کب اور کس تناظر میں استعمال کرتا ہے اس کا ادراک تو کم از کم ہمیں ہونا ہی چاہئے ورنہ ہمیں صاحب کتاب تو دور کی بات ایک ادب نواز ہونے کا بھی دعویٰ نہیں کرنا چاہئے۔ اب جہاں

تک ان افسانوں کے کرداروں کا تعلق ہے ایک ہندو یا ایک سکھ کے پیچھے بھاگنے والے ایک کتے کی کہانی آج کے تناظر میں پڑھی جائے گی ، اس افسانے کے ماتھے پہ کہیں بھی فاضل قلمکار نے یہ کیپشن نہیں لکھا ہے کہ اسے کسی برسوں پرانے فساد کے تناظر میں پڑھا جائے یہی حال دیگر افسانوں کا بھی ہے۔ زیتون کے پتے پہ سوار یہ سبز پوش کون ہے؟ روز محشر اور شیطان کا حال تو سب نے کہیں نہ کہیں پڑھا ہوگا۔ قاری کو اجنتا اور الورہ کی منطق سے بھی واقف حاصل ہوگی اور انہوں نے مہابھارت کے ید کا حال بھی پڑھا ہوگا اُسے رامائین کے کرداروں کا بھی ادراک ہے اور وشوامتر کی کہانی سے بھی واقف۔ کوئی ان میں فلسفہ شیو کا بھی قاری ہوگا اور کوئی آج بھی کشمیری لوگ گیت ''ہوکُس ، بہ گُس ، تیلہِ ون ژُگس'' کا مفہوم جانتا ہوگا۔ کسی نہ کسی کو 'اکھ ژِتہ بییہ بہ گنز رمہ با'' کا تصوفانہ فہم و ادراک بھی حاصل ہوگا لیکن ان تمام باتوں کے باوجود قاری خود اپنے نقطہ نگاہ کو واضح کرنے کا حق رکھتا ہے جو غلط بھی ہوسکتا ہے۔

''ادھوری کہانی'' میں ہی محمود ہاشمی کی یہ تحریر صفحہ (۹) پہ درج ہے ''ہم اپنے عہد کے افسانہ نگاروں سے سپاٹ قسم کی حقیقت نگاری نہیں بلکہ اس تخلیقی تجزیے کے منتظر رہتے ہیں جو اس کے افسانے کو تہہ داری بھی عطا کرے اور مفاہیم کی بے شمار سمتوں کو تعین بھی کرے''

اب اگر بحثیت ایک طالب علم کے ان افسانوں میں صرف حقیقت نگاری نظر آتی ہے اور اُس حقیقت نگاری میں بھی ایک ہی نظریہ تو میں کیا کیا جائے ، محمود ہاشمی کے الفاظ رس گھول کے پی تو نہیں سکتے ، ہمیں ایک ادیب کو ادیب کی نظر سے ہی دیکھتا ہے وہ کرشن چندر ہوسکتا ہے ، سعادت حسن منٹو ہوسکتا ہے۔ ہمیں فنکاروں میں فرق محسوس کرنا

نہیں آتا صرف فنکاروں کے نظریاتی منطق سے اختلاف کرنے کا حق استعمال کرنا آتا ہے اور یہ حق میں نور شاہ کے افسانوں کو پڑھنے کے بعد بھی استعمال کیا جاسکتا ہے اور عمر مجید کے افسانوں کو پڑھنے کے بعد بھی۔

حقانی الحق قاسمی نے اس کتاب کے بارے میں اس بات کا اعتراف کیا ہے

''ویریندر پٹواری کی کہانیاں میں نے کسی نظریے کی عینک سے نہیں بلکہ دیو مالائی اساطیری مذہبی حکایات وقصص کے تناظر میں پڑھی ہیں۔ میرے سامنے افسانوی تجزیہ و تشریح کی نہ کوئی مستند کتاب ہے اور نہ افسانوی فن سے متعلق تنقیدی فرمودات۔ اس لئے ان کہانیوں کی تفہیم میں بھٹکا ہوں، بھٹکنا اور مسلسل بھٹکنا... میرا پرانا شیوہ بھی ہے اور قدرے دلچسپ شغل بھی۔ مجھے اس بے بضاعتی اور بے تفہیمی کا حساس ہے جو اکثر فن پاروں کو پڑھتے ہوئے میرے اوپر مسلط رہتی ہے۔ پٹواری جی کی کہانیوں کو میں نے جن زاویوں سے سمجھنے کی کوشش کی ہے وہ افسانوی تفہیم کے لئے یا کسی فن پارے کی تعین قدر کے لئے یقیناً مفید یا کارآمد ثابت نہیں ہوسکتے مگر کیا کیجئے کہ میرے پاس فن پارے کو پرکھنے کا نہ کوئی اعلیٰ پیمانہ ہے اور نہ ہی اسکی تفہیم کا بلند و بالا معیار، میری آنکھیں مجھے جن جن مقامات، منازل اور مناکب تک لے گئیں اور میرا ذہن جن مسالک اور مناہج تک پہنچا بس وہیں تک میں نے ان کہانیوں کو سمجھا ہے، یہ الگ بات کہ غلط سمجھا یا صحیح، اس کا فیصلہ نہ میں کرسکتا ہوں اور نہ شاید آپ، آنے والا وقت یا مستقبل کے ادبی فنی معیارات ہی اس سلسلے میں کوئی تحکیم کرسکتے ہیں۔........بہت سی کہانیاں علامت وابہام کے غمام میں ڈھکی ہوتی ہیں تو بعض صبح کی طرح درخشاں''

اب ان پرمغز سطروں کو پڑھنے کے بعد مجھے بھی اس بات کا اعتراف ہے کہ

میں دلی میں بیٹھے ہوئے حقانی القاسمی کی طرح کہانیوں کو دیو مالائی قصوں کی طرح نہیں پڑھتا کیونکہ بات صرف اساطیری، مذہبی حکایات و کرداروں سے ناواقفیت یا واقفیت کی نہیں بات اُس تاریخ کی ہے جسے اپنے وقت کی کتابوں سے تحریریں اور جذبات مستعار لے کر تواریخ دان رقم کرتے ہیں تب ہمارے افسانوں کے بطن میں چھپے زہر یا تریاق کا فرق بتانے کے لئے ہم موجود ہوں یا ہوں لیکن ہمارے لفظ بولینگے، تب ہماری رقم کردہ سطور میں چھپے بین السطور نظریے چلاّ ئینگے اور یوں ہماری یہی کہانیاں ہمارے زمانے کی ''جھوٹی تاریخ'' بن جائے گی ایک ایسا جھوٹ جس پر علامتی زرباف سجایا گیا ہوگا۔افسوس حقانی جیسے لوگ کشمیر کے بارے بہت کچھ لکھتے تو ہیں لیکن کشمیر کے زمینی حقایق کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔اس سے بہتر تو یہی تھا کہ وہ اپنے تبصروں میں افسانے کی کسی فارمولا کے زیرِ تابع اپنا خطبہ ارشاد فرماتے اور یوں، ہم بے چارے کشمیریوں پر رحم ہی کھاتے تو بہتر۔.....................................

(جنوری ۲۰۰۴)

نورشاہ کے افسانوی مجموعے

''بے ثمر سچ''

کا ایک جائزہ

مجھے نورؔشاہ کی بہت ساری تخلیقات ایک ساتھ پڑھنے کا بہت شوق تھا اور یوں ''بے ثمر سچ'' کو میں نے مصنف کی ترتیب کے اور اُس میں شایع مختلف اہل قلم کی آرا کے بغیر پڑھا۔ پہلے افسانے کو شاید پانچویں نمبر پہ اور آخری افسانے کو شاید گیارہویں نمبر میری یہ بے ترتیبی قلم کار اور قاری کے درمیان ترسیل کی ناکامی کا سبب نہیں بنی۔ میں نے نورشاہ کے ''سچ'' کو حرف حرف پڑھنے کے بعد اُسکے ''ثمر'' کو پانے میں شاید کامیابی حاصل نہ کی ہو لیکن میرا مطالعہ ''بے ثمر'' بھی نہ رہا۔

''سچ'' کے قرطاس پہ عورت سوار ہے اور عورت کے اعصاب پر ''کتے'' کی طرح جنس..... یا پھر ایک ہی موضوع کے مختلف رنگ کتے اور انسان کو ہم رنگ بنا چکے ہیں۔ ہر چیز میں کیا صرف سیکس ہے۔ فرائڈ کی ''سچائی'' سے لیکر نورؔشاہ کے ''بے ثمر سچ'' تک ایک سلسلہ ہے۔ تجرباتی جنس کا، ہم جنس پرستی کا، اور جنسیات کے اُن لمحوں کا جنھیں ایک عمر رسیدہ شخص بھی اپنی آنکھوں میں جذب کرتا ہے۔ ''زمان و مکاں'' اور زبان و بیاں کے تناظر میں مجھے کسی کفر سے ہمکنار نہیں ہونا ہے کیونکہ وہ کافر ہی ہوگا جو قلم کار کی

زبان پہ دسترس سے انکار کرے۔ لیکن قلم کار کو جہاں اس سیکس سے باہر بھی کچھ موضوعات ملے ہیں اُن پر بھی بڑے باریک پردے پڑے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ''آپ آپ''... ''لکیریں''.....بس ایک فلسفہ'' ...مُشتے نمونے از خروارے

''گھوڑی سے لیکر کتیا تک ...ہیڈ ماسٹر سے لیکر گھوڑے بان تک اور حد یہ کہ باتھ روم سے لیکر بیڈ روم تک بس اُنہی تین حروف (SEX) کا حصار،۔ قاری کے ذہن کو تمام غم و آلایشوں کی دنیا سے دور لے جا کر ایک سجے سجائے تصوراتی عالم میں مقیّد کرنے کا جتن۔

میں عصمت، فرائڈ اور منٹو کی کتابوں کے شلف میں نور شاہ کا ''سچ'' بھی سجا کے رکھ دوں گا لیکن سب کی نظروں سے چھپا کے۔ وہ حصہ میری لائبریری کا ''گوشہ ممنوعہ'' کہلاتا ہے۔ کتاب تالہ بند حصے میں قید ہو جائے گی۔ معاملہ تواریخ کا ایک حصہ بن جائے گا اور تاثر بس اتنا کہ..........

''انسان شاید خود ''اُس کیچڑ'' کا حصہ ہونے کے باوجود جوتے صاف کر کے ہی اپنے گھر کی دہلیز کو پار کرتا ہے۔''

میں ایسے افسانوں کی فنی خوبصورتی پر ایک قصیدہ بھی لکھ سکتا ہوں لیکن میں ان موضوعات کی تشہیر کو بھی ''گناہ'' سمجھتا ہوں۔ میں مجموعے میں شامل ''رات کا سورج'' اپنے گھر کے ہر گوشے میں تاباں دیکھنا پسند کرونگا لیکن میں ''خوشبو کا سفر'' پڑھ کے بھول جانا چاہتا ہوں۔ یہ ایک قاری کی پسند ہے اور یہ بھی ایک سچ ہے کہ قاری کی پسند کا اثر قلمکار کے ارادوں کو متزلزل نہیں کرتا۔ کوئی بدن کے طاق پہ لطافت اور لذت کا ایک گلدان سجانا چاہتا ہے اور کوئی انہیں لذتوں اور لطافتوں میں ایک اَن دیکھی تڑپ کو محسوس

کرتا ہے اور بقول بشیرؔ شاہ.... نور شاہ منٹو نہیں ہو سکتا۔ ''نور شاہ کی سانس سانس کہانی ہے''۔ مجھے بشیر شاہ کی اس بات سے اتفاق ہے (کتاب کا یہ حصہ میں نے آخر میں پڑھا ہے) لیکن کیا ایک حساس انسان کی ہر سانس، ہر لمحہ، ہر پل، ہر حال میں بس ایک ہی راگ الاپتی ہے۔ مدت سے کسی پیاسے کے لئے ایک خوبصورت عورت کے جسم سے زیادہ دو بوند پانی کی اہمیت بھی ہوتی ہے۔

انسانی ارتقامیں ''ایک لمحے کی جنت'' بھی ہے لیکن یہی لمحہ پوری زندگی نہیں۔!

نورؔ شاہ بسیار بھی لکھتے ہیں اور خوب بھی لیکن خوبیوں کے ساتھ ساتھ مجھے ایک ساتھ اتنے افسانے پڑھنے کے باوجود بھی نہ جانے کیوں ''یک رنگی مناظر'' نگاہوں کے سامنے رقص کرتے ہوئے دکھائی دیئے۔ مجموعہ ''بے ثمر'' نہیں ہے کیونکہ اس پر بہت کچھ لکھا جائے گا اور اس پر بہت کچھ لکھنے کی بھی گنجائش ہے۔ میں صرف ایک تاثر کو الفاظ دینے کی جرأت کر رہا ہوں۔ میں مجموعے کی قیمت، کمپوزنگ، جلد سازی یا خوبصورتی سے الگ اس میں شامل کہانیوں کی روح میں اُترنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ہر روح... جیسے جسم کے چھیتڑوں میں چھپی ہوئی۔ ہر ذی روح جیسے ایک کتے یا کتیا کی طرح زبان باہر نکالے ہوئے رال ٹپکاتا ہوا۔ حیوانیت اور انسانیت کی تمام حدیں مسدود۔ اور قاری بھی شاید اس بات کا اعتراف کرتا ہوا کہ یہ سب ''سچ'' ہے لیکن.... اس ''سچ کی صلیب'' پر کس کو لٹکایا جائے۔ ایسے افسانوں کو چٹخارے لے کر پڑھنے والے کو یا ایسے افسانے کی تخلیق کو علم کی کوکھ میں پالنے والے کو۔ مرض کی نشاندہی مرض کی دوا نہیں۔ تشخیص کا اصلی مرحلہ تب آتا ہے جب قلم کار محرر کے بجائے معالج بنتا ہے۔ یہاں نور شاہ نے ''تشخیص'' کو ''عریاں'' کر کے تو رکھ دیا ہے لیکن وہ اپنے قلم کو نشتر بنانے میں

کامیاب ہوتے ہوئے (کم از کم مجھے) دکھائی نہ دئے۔ ہاں ایک بات اپنی جگہ پہ صحیح ہے کہ قلم کار معالج ہو ہی نہیں سکتا۔ بلاخر ایک طبیب اور ایک قلمکار میں یہی تو فرق ہے۔ ایک تخلیق کی ذات کو کریدنے کا عمل دہراتا ہے اور دوسرا تخلیق کی صفات میں گُم ہو جاتا ہے اور نور شاہ جیسے معتبر قلمکار نے ان گہرائیوں میں غوطہ زن ہوکر اپنے قلم کی آنکھ سے بہت باریکیاں تلاش کی ہیں۔

ہر نیا فن پارہ، لباب لب بھرے ہوئے دودھ کے پیالے میں خوشبو بن کے سمائے تو اسے فنکار کا معراج کہا جاسکتا ہے۔ اضافت رسمی ہو یا روایتی۔ شعوری ہو یا غیر شعوری۔ ہر زائد قطرہ جام سے باہر چھلک پڑتا ہے اور چھلکتے ہوئے قطرے خود بھی پیاسے رہ جاتے ہیں اور پیاسوں کی بھی پیاس نہیں بجھاتے۔ اپنے آپ کو یا گھسے پٹے موضوعات کو دہرانے کا عمل ری مکس کا رواج سہی لیکن اسکا اثر زیادہ دیر تک ادب کے ایوان میں نہیں رہتا۔ ....(اختلاف کرنے کی گنجائش ہر حال میں موجود ہے)

اللہ کرے نور شاہ کا قلم قاری کی لذتوں کو نہیں بلکہ اُن کی روحوں کو سیراب کرے کیونکہ نور شاہ کے قلم میں دم ہے۔ نور شاہ افسانے کے فن سے آشنا ہیں۔ نور شاہ زبان و ادب کے پاسباں ہیں۔ وہ موضوعات کی زرخیزی سے کئی چنار اُگا سکتے ہیں اور اپنے فن کے آسمان پہ کئی سورج روشن کر سکتے ہیں۔ میری دعا ہے کہ ''سچائیوں'' کے چہروں سے اُس کے قلم کی نوک پردہ اُٹھاتی رہے۔ کیونکہ اردو ادب میں نور صاحب جیسی قد آور شخصیت سے ابھی ہم جیسے طفل مکتب بہت کچھ سیکھنا چاہتے ہیں۔☆☆

(جون ۲۰۰۸ء)

غلام نبی ناظر کا مجموعہ اردو شاعری

''چھکتی کرنیں''

(ایک تجزیہ)

اُردو بڑی میٹھی زبان ہے۔ یہ بلآخر اُن کو بھی اپنے دامِ اُلفت میں پھنسا لیتی ہے جو دیگر زبانوں کے ساتھ اپنی بے پناہ محبت کے داعی ہوتے ہیں۔ ویسے بھی یہ بات مسلّم ہے کہ ہر تخلیق اپنے ساتھ اپنی زبان اور اپنا اسلوب لے کر آتی ہے۔ اصل میں زبان ایک پیراہن ہے تخیل کے اُس پری پیکر کا جو قرطاس کے ایوانوں میں اپنے دل نشین رقص کے ساتھ شایقین کو اپنے حسن کا گرویدہ بنا دیتا ہے۔

اُردو زبان وادب کے آسماں پہ چمکتے ہوئے سورج آج بھی اپنی ضوفشانی کے ساتھ ساتھ اپنے تخیلاتی کرشموں سے جاوداں ہیں۔ کشمیر میں فن وادب کا ارض وسما بھی اس معاملے میں کسی بھی خطِ ادب سے کم نہیں۔ ایک یا ایک سے زیادہ زبانوں میں اپنے ادب کی ''کرنیں'' بکھیر والے کہنہ مشق اور نامور قلمکاروں میں محترم غلام نبی ناظر صاحب بھی کسی تعارف کے محتاج نہیں لیکن اُن کا زیرِ نظر اُردو مجموعہ کلام ان کی ہمہ جہت شخصیت کا ایک ایسا تصور لے کر جلوہ گر ہوا ہے جس میں اُن کی بے تابیوں کا جلوس بھی نظر آتا ہے اور اُن کے اشتیاق کا عکس بھی۔ ناظر صاحب کشمیری زبان کے ان شہہ سواروں

میں شامل ہیں جن کے دم سے آج کا کشمیری کاروانِ ادب رواں دواں ہے لیکن کیا اُن کی ''چھکتی کرنیں''، نامی کتاب اُردو ادب کے خزانے میں کوئی اضافہ کرنے میں کامیاب ہوگی اس سلسلے میں اس کتاب میں شامل کئی کہنہ مشق نقّادوں اور زبان دانوں جن میں حامدی صاحب۔ شبیبؔ رضوی صاحب اور محمد یوسف ٹینگ صاحب کے نام گرامی شامل ہیں کی آرا اتفاق واختلاف کے کئی رنگ لئے منظر عام پہ آئی ہیں بہر حال سکہ ادب کے یہی وہ دو رخ ہیں جن سے کسی بھی زبان کے ادب کا سلسلہ روز وشب قائم ہے۔ اور ہمیں ان دونوں احساسات کی روشنی میں ہی ہر ایک تصنیف کو پرکھنا چاہیئے۔ اب جہاں تک کتاب میں شامل آرا کا تعلق ہے۔ حامدی صاحب کو ناظر صاحب کی اُردو شاعری میں خلاقیت اور لفظوں کی درو بست کا عکس تو نظر آیا ہے لیکن اُنہیں ناظر صاحب کے مجموعے میں غالب کی ''بالیدن مضموں عالی'' کا پرتو دکھائی نہیں دیا۔ ٹینگؔ صاحب کو ناظر صاحب کے اُردو کلام میں زبان کی برجستگی سے زیادہ احساس کی تازگی باعث تسکین نظر آئی ہے جبکہ شبیبؔ رضوی صاحب نے ناظرؔ صاحب کے تخیل کا قد اُونچا اور لفظوں کی بیساکھیاں کا قد چھوٹا قرار دیا ہے۔ ان مختصر تجزیاتی جملوں کے آئینے میں سوال یہ اُبھرتا ہے کہ کیا کشمیری ادب کی معطر زلفوں کے ساتھ پچھلی کئی دہائیوں سے عشق فرمانے والے ناظر صاحب کو یقیناً اُردو زبان کے مہکتے بدن کے نشیب وفراز کا لمس حاصل کرتے ہوئے خود ایک سرور تو ملا ہے اور کیا وہ اس کیف وسرور کی وادیوں میں قاری کو بھی اپنے ساتھ لے جانے میں کامیاب ہوئے ہیں ؟ اس کیفیت کے بارے میں ابھی محققین کو اور بھی باریک بینی سے '' کچھ تلاش کرنا ہوگا۔ حالانکہ محترم شبیبؔ رضوی صاحب کے مطابق ناظرؔ صاحب خوبصورت شعروں میں معانی کی نئی کائنات بسا پانے کے ساتھ ساتھ

مفاہیم کے خوبصورت پیکر تراشنے کی انتھک جدوجہد کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں یعنی یہ کہنا مبالغہ آرائی کے مترادف نہ ہوگا کہ کشمیری زبان کی بلند چوٹی پہ براجمان ناظرؔ صاحب اپنے اندر متحرک اُس اردو شاعر کو خود بھی ایک ٹیلے پہ چڑھتے ہوئے دیکھ رہے ہونگے جسے ابھی بہت لمبا سفر طے کرنا ہے اور کیا معلوم ایک کہنہ مشق ''کشمیری ناظرؔ'' دوسرے متحرک ''اُردو ناظرؔ'' کو اپنے ہی اس شعر سے ترغیب دے رہا ہو:

ہر قدم اک دیا جلاتا ہوں　　　اور تلوؤں سے خون بہنے دو

ناظرؔ صاحب کو اُردو زبان پہ دسترس حاصل ہے اور وہ اس زبان کی لطافتوں سے بھی بہرہ ور ہیں لیکن ہمارے ہاں ادب میں ایک بڑی بھدی سی روایت قائم ہو چکی ہے کہ یہاں کسی قلمکار کو ایک بار کوئی لیبل مل گیا تو وہ عمر بھر اُس کے ماتھے سے چپکا ہوا رہتا ہے۔ زبان و ادب کے وسیع و عریض کائنات میں تخیل کے نئے طائر اُڑانے میں کوئی بندش نہیں لیکن ستم ظریفی یہ کہ یہاں اُردو میں لکھنے والے کشمیریوں کو اور کشمیری میں لکھنے والے اُردو لکھنے والوں کو یہی نصیحت کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں کہ ''اُس خوشہ گندم کو چھونا نہیں'' اور اس پہ طرہ یہ کہ جب کوئی چھونے کی جسارت بھی کرتا۔ ہے تو اُسے باغ بہشت سے نکل جانے کا حکم دیتے ہوئے اپنے چند ہم نواوں کے ساتھ جنت کو اپنی ملکیت جتانے کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔

ناظرؔ صاحب اُن مستند اور معتبر قلمکاروں کی صف میں شامل ہیں جنھوں نے کئی نو آموز اور نو جوان شعر کی ادبی آبلہ پائی میں رہبری کی ہے لیکن کیا ''چھکتی کرنیں'' اردو زبان میں خامہ فرسائی کرنے والے نوجوان شعرا کے لئے ویسا ہی درجہ پا سکتی ہے جیسا کہ اُن کی متعدد کشمیری کتابوں نے حاصل کیا ہے اس ضمن میں ٹینگؔ صاحب کا یہ کہنا بجا

ہے کہ اس چھوٹے سے اُردو مجموعے میں اچھے اشعار کئی جگہوں پر جگنوؤں کی طرح روشنی کے بھنور پیدا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں حالانکہ ناظر صاحب خود اس بات کے معترف ہیں

ہم وادیٔ خیال میں آخر اُتر گئے — کچھ کچھ سمٹ کے رہ گئے، کچھ کچھ بکھر گئے

تصویر بُن رہے تھے یوں جلتے حروف کی — ناظرؔ اندھیری رات میں کچھ کام کر گئے

ناظر صاحب کا کشمیری زبان کے ساتھ ساتھ اُردو زبان کے تئیں اُنس۔ ''بہتے شعلے'' سے ''چھکتی کرنیں'' تک کی آبلہ پائی کا ایک ناتمام سلسلہ اس بات کا بھی غماز ہے کہ ناظر صاحب کا اندرون سکڑنے کے بجائے بیرونی دنیا کائینات میں پھیلنے پہ بضد ہے اسی لئے وہ اپنے نئے قالب تلاش کر کے اپنی نئی فضاؤں میں اُڑان بھرنے کا متمنی نظر آتے ہیں۔ ناظرؔ صاحب خود ہی خود میں ایک سمندر ہیں اور سمندر کے سینے میں ساحل سے ٹکرانے کا شوق اس لئے موجزن ہوتا ہے کہ وہ اپنی وسعتوں کے آگے کھینچی گئی حدوں کو قبول کرنے پہ آمادہ نہیں ہوتا۔ خدا بہتر جانتا ہے (وہی سمیع والبصیر ہے) کہ ناظر صاحب اپنے سمندر سے کیسی کیسی موجوں کو اُبھار کر اپنے ارتعاش۔ اپنے اضطراب، اپنے شوق اور اپنی قادر الکلامی کے مدوجزر پیدا کرینگے۔ یہ قلمکار خاموش بیٹھنے والوں میں سے نہیں۔ اس نے اگر زندگی کا ایک پڑاؤ طے کیا ہے تو دوسرے پڑاؤ کے ابتدا میں ہی وہ اپنی مطبوعات کا وہ ذخیرہ لے کر سامنے آرہے ہیں کہ لگتا ہے ایک دن یہ نام ہر لائبریری کے سینے میں، ہر سخن شناس کی زبان پہ اور ہر طالب علم وفن کے دل میں منعکس ہوگا۔ ہم نے اس صاحب علم وادب سے بہت کچھ سیکھا ہے اور ابھی ہمیں اس چراغ کی روشنی میں اور بھی کئی منزلیں پانے کی سعی کرنی ہے۔ ☆☆

سید یعقوب دلکش کے کشمیری افسانوی مجموعے

''بند مکانس منز''

کا ایک تجزیہ

علامتیں سُپرِدِ قرطاس کرنا۔ علامتوں سے معنی وافکار کی نئی راہیں ہموار کرنا، علامتوں کے پیراہن میں عریاں حقیقتوں کا اظہار کرنا اور علامتوں سے تخلیق کو معراج عطا کرنا... یہ سب کہنہ مشق قلمکار کے لئے بازیچہ اطفال کی مانند ہے لیکن سید یعقوب دلکش کے تازہ ترین افسانوی مجموعے ''بند مکان میں'' (بند مکانس منز) اور بھی بہت کچھ ہے۔ وہ کچراجوانسان کے اندروں سے نکل کر بند مکان کے ہر گوشے اور ہر کونے میں اپنی موجودگی کا احساس تو دلاتا ہے لیکن کوئی اُسے ڈھونے کی قباحت کو برداشت کرنے کی جرات نہیں کر پاتا۔ یہ ارتقاء آدم کا ایک ایسا پہلو ہے جسے دلکش نے افسانہ ''بند مکان'' میں تخلیق کیا ہے۔ ایک ایسا مکان جہاں حُسن قدرت کی کرنوں کو داخلے کی اجازت نہیں، ایک ایسا مکان جہاں بدلتی رتوں کا ست رنگی عکس درودیوار پہ رقصاں نہیں، جہاں ابابیلوں کا'' والتین والزیتون '' وِرد کرنے سے پہلے ہی گلہ گھونٹ دیا جاتا ہے، جہاں کوئل خود اپنے نغموں پہ ماتم کناں ہے اور جہاں خود پرستی اور انا پرستی کی گھٹن میں ذہنوں پہ چھائی ہوئی سیلن بتدریج اپنا احاطہ کئے ہوئے نظر آتی ہے اور یوں اُن بند مکانوں کے ذہنوں میں نفرت، کراہت اور کثافت کے ڈھیر جمع ہوتے ہیں جن پر خباثت کی کتیا آئندہ نسلوں کی پرورش کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔

یہ پُر مغز علامتیں اپنے اندر تہہ در تہہ سچائیوں کا عکس پنہاں کئے ہوئے اس

مجموعے میں جا بجا نظر آتی ہیں ۔کبھی مکانوں کی چھتوں پہ آسمان سے الاماں مانگنے والے بونے لوگوں کے روپ میں جنہیں زمین پہ رینگتے ہوئے خوفناک سانپوں سے بچنے کا کوئی راستہ نہیں سوجھتا اور کبھی یہ وقت کے اژدھے کی طرح انسانی ارتقا کے ماضی، حال اور مستقبل کو اپنے سحر اور زہر کا اسیر بناتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس مجموعے میں کبھی تحریروں کا ایک ایسا منظر بھی نگاہوں تلے آجاتا ہے جیسے ہزاروں لاکھوں بد ہیت اور دہشت ناک کیڑے قرطاس پہ رینگ رہے ہوں لیکن جب قاری افسانوں کے انجام تک پہنچتا ہے تو اُسے یہی کیڑے اپنے شعور اور تحت شعور میں رینگتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں، یہاں افسانہ نگار کے تحریر کردہ الفاظ قرطاس سے اُڑ کر قاری کے ذہن میں پرواز کی ترغیب دیتے ہوئے نظر آتے ہیں، نگاہوں سے گزر کر نسیاں کے طاق پہ براجمان ہوتے ہوئے دکھائی نہیں دیتے اور یوں افسانہ نگار اپنی تخلیقی اُڑان میں سرخرو ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

یعقوب نے متعدد افسانوں میں ''سانپ'' کو مختلف انداز سے پیش کیا ہے، جیسے ایک ہی object کی مختلف زاویوں سے کئی تصویریں لی گئی ہوں۔ کہیں کہیں یہ ایک ہی علامت قاری کو کنفیوزیژن کا شکار بھی بنا دیتی ہیں لیکن افسانے خود اس بات کے گواہ ہیں کہ سانپوں کا ہر پوز اپنی جگہ پہ متاثر کن ہے۔

اگر اس ''بند مکان' کا چاروں سمتوں سے جایزہ لیا جائے تو اسکی ایک سمت میں ارباب اقتدار کے کھوکھلے پن کی وہ دیوار نظر آتی ہے جس کی بنیادوں میں ''مچھلیوں'' کا ایک ایسا جھنڈ ہے جن کے لبوں پر معنی خیز اور علامتی مسکراہٹ منجمد ہو چکی ہے لیکن جب حرارت ادراک سے نگاہوں کے سامنے جمی برف پگھلتی ہے تو علامت خود ایک

''افسانہ'' بن جاتی ہے۔ بند مکان کی دوسری سمت میں ایک گمنام قبرستان ہے۔ اُن اشخاص کا جو پیشانی پہ گولی کھا کے اپنی خاموش زبان سے کلمہ احتجاج بلند کرتے ہوئے نظر آرہے ہیں اور تیسری سمت کا تعین تو شاید اہل بصیرت بھی نہیں کر پاتے کیونکہ منزل کا تعین بھی ادراک کا مرہون ہے اور ہماری، آپکی اور دلکش کی کائینات میں اہل چشم تو بہت ہیں اہل نظر عنقا۔ اسی لئے تو مکان کی تیسری دیوار کے بطن میں اندھیرے کا بدہیت بچہ جنم لینے کے لئے مچل رہا ہے یا شاید جنم لے بھی چکا ہے کیونکہ احساس واحتساب کی سوچ کو پناہ دینے والوں کے خلاف ''قتل عام'' کا نقوس بج چکا ہے۔ ہر سو سناٹا ہے اور ہر گام پہ پہرے ہیں۔ ''بند مکان'' کی چوتھی سمت پر پہنچتے ہی قاری کے قدم جیسے ساکت ہو جاتے ہیں کیونکہ وہاں ہر لفظ اپنے گونگے پن کا متقاضی لگتا ہے جیسے وہ اپنے زمان ومکان کی وحشت سے گھبرا مکان کی ایک بوسیدہ دیوار کی آڑ میں روپوش ہونے کی کوشش کر رہا ہو لیکن... یہاں دلکش کا فن ان روپوش لفظوں کو ایک قوت گویائی عطا کرنے میں کامیاب ہوا ہے اور یوں بند مکان کے سارے دریچے ''وا'' ہو جاتے ہیں۔ ایک جدید سوچ کے استقبال کے لئے۔ میں کہانیوں کے خلاصے تجزیئے یا تبصرے میں بیان کرنے کا قائل نہیں کیونکہ ہر افسانہ پڑھنے سے ہی تعلق رکھتا ہے۔

ہاں گلہ یہ ہے کہ اتنی اچھی کہانیاں شاید علامتوں کے پیراہن میں کہیں عام ذہنوں تک ترسیل کی ناکامی کی شکار نہ ہو جائیں اور یوں نقاد اسے ''ابہام'' کے زمرے میں رکھ کر اسکی سوچ کو پہروں کی تلوار سے چھلنی نہ کردے...... یوں بھی ایسے افسانے کسی خاص قاری کے لئے ہی لکھے جاتے ہیں اور خود مصنف کا یہ اعتراف کہ بات ''کثرتِ عام'' کی بجائے ''مخصوصِ چند'' تک ہی پہنچے تو کیا بُرا ہے۔ (جنوری ۲۰۰۹ء)

ویریندر پٹواری کا کشمیری افسانوی مجموعہ

''علم''

(ایک تجزیہ)

کسی گھر میں ایک ادیب، شاعر، فلمکار یا کسی اور فنون لطیفہ سے وابستہ فنکار کا ہونا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ کئی ایسے تخلیق کار ہیں جو قلم کی نوک سے زندگی کی شہہ رگ کو چھیڑتے رہتے ہیں مگر ایک عالم ایسا بھی ہوتا ہے جسے محض ایک اتفاق نہیں کہا جاسکتا وہ یہ کہ ایک ہی گھر کے تین بھائی ایک ہی دور میں نامور افسانہ نویسوں کی صف میں شامل ہیں.... اشوک پٹواری... راجندر پٹواری اور ویریندر پٹواری۔ سونے پہ سہاگہ یہ کہ ان تینوں صاحب زادوں کے والد گرامی بھی خود ایک فنکار تھے۔ یعنی تینوں کو وراثت میں ایک کہکشاں ملی ہے اور تینوں اپنے اپنے حصے کی ضوفشانی میں مصروف عمل ہیں۔

ویریندر پٹواری اردو ادب میں کسی تعارف کے محتاج نہیں لیکن کشمیری ہونے کے ناطے اُن کی یہ دلی خواہش ہے کہ اُن کی یہ انفرادی شناخت دورِ فلک کی گردشوں میں ماند نہ پڑ جائے۔

''علم'' ویریندر جی کے کشمیری افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ اس میں ایسے کئی

افسانے ہیں جن کی رگ رگ سے آج کے ماحول کا لہو ٹپکتا ہے حالانکہ یہ بات بھی اپنی جگہ مسلّم ہے کہ جہاں جہاں بھی فاضل قلمکار نے افسانوں میں اپنا نظریہ، اپنا نکتہ نگاہ سپرد قرطاس کرنے کی کوشش کی ہے وہاں اُن کے بے لاگ و بے لوث مشاہدے کے آئینے میں خراش کا عکس بھی اُبھرا ہے اور شاید یہی ایک خراش سارے افسانوی مجموعے میں باعث اختلاف ہے...لیکن..... جہاں تک ادبی نوعیت کے ان خوبصورت افسانوں کا تعلق ہے یہ سارے افسانے موتیوں کی طرح کتاب کے صفحات پہ منقوش ہیں۔ ایسے نگینوں کی طرح جن میں ایک سنجیدہ قلمکار کی نازُک حس۔ ایک تڑپتی روح۔ ایک معصوم چاہ۔ اور ایک وجدانی فنکاری موجود ہے اور جواُن کے اندرون میں اپنی آتشیں تاثیر سے قلمکار کو اضطرابی کیفیت کا شکار بنا دیتی ہے۔ یہ افسانے پڑھتے پڑھتے قاری کو یہ احساس بھی ہو جاتا ہے کہ افسانہ نگار ''علم'' لیکر صرف ایک کہانی۔ ایک پلاٹ یا چند کردار لیکر کوچہ سنگ میں نہیں آیا ہے بلکہ اُن کی ہر سطر، ہر جملے، ہر استعارے اور ہر علامت میں ایک ایسی کائنات پنہاں ہے جس کی گہرائیوں میں غوطہ زن ہونے کی ضرورت ہے۔ تبھی ''بات میں سے بات'' نکلتی ہے۔ اور یوں سیپ میں سے موتی نکلتا ہے۔ میں نے ان افسانوں کو بارہا بھی پڑھا اور بار بار بھی پڑھا۔ ہر بار مجھے یہ افسانے اپنی خوبصورت تحریروں کے پیراہن میں دلکش بھی نظر آئے اور دل سوز بھی۔ کہیں کہیں مجھے ان افسانوں میں ویریندر جی خود بھی کسی نہ کسی کردار کا لبادہ اُوڑھے ہوئے دکھائی دئے۔ کہیں پہ دادا بن کے، کہیں مایگرنٹ کے بھیس میں یا کہیں ایک لاچار باپ کا بیٹا بنے ہوئے۔ ہر افسانے میں کشمیر کا درد آنسو بن کر ٹپک رہا ہے۔ اور ان افسانوں میں اُنہوں نے خود اس بات کا عکس پیش کیا ہے کہ موجودہ صورتحال بذات خود ایک بے بسی کی ایک علامت ہے۔

یہاں تک کہ اُنہیں ''موج کشیر'' (ماں کشمیر) جو اُسے ''فاطہ'' (فاطمہ) کے روپ میں ملی تھی بھی بے بس و بے آسرا نظر آتی ہے۔ حد یہ کہ اُنہیں کبھی کبھی یہ ماں بھی پرائی لگنے لگتی ہے۔ اُنہیں شکوہ ہے کہ وہی ماں (فاطمہ) جس نے اُسے بچپن میں پاگل کتے سے بچایا تھا ...اُسے تب اپنے آنچل میں کیوں نہ چھپا سکی جب وہ گھر سے ہجرت کرنے پہ مجبور ہوا تھا۔ دیکھا جائے تو چند افسانوں کے موضوعاتی گارے کو تخلیقی چکر پہ گھماتے گھماتے افسانہ نگار نے کہیں کہیں ان موضوعات کی کچھ باریکیوں کو پنہاں رکھنے کی شعوری کوشش کی ہے۔ اگر یہ پردہ نہ رکھا گیا ہوتا تو ''علم'' کا موجد ایک دلیر اور معتبر افسانہ نگار ہی نہیں بلکہ ایک جرات مند تواریخ نگار بھی ثابت ہوتا لیکن یہ بات بھی سچ ہے کہ ویریندر جی نے ''علم'' میں افسانے لکھے ہیں تاریخ لکھنے کا اُنہوں نے دعویٰ بھی تو نہیں کیا ہے۔ ورنہ اپنی رام کہانی سناتے سناتے اُس کردار کو فاطہ کے اُس بیٹے کی بھی یاد آتی جو کہیں بارود کے ذروں کی نذر ہو گیا ہے۔ ہجرت کرنے والے نے بھاگتے ہوئے یہ بھی نہ سوچا کہ اُسے بچپن میں اپنے آنچل تلے چھپانے والی ماں خود اب اپنے یوسف کنان کی جدائی میں پاگل ہو چکی ہے۔ بہر حال یہ رہی موضوعاتی باتیں۔ اب جہاں تک ادبی فنکاری کا تعلق ہے اس مجموعے میں کئی خوبصورت افسانوں کے دلنشین گل اپنی خوشبو بکھیرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ویریندر جی کے روم روم میں آج کا افسانہ رچ بس گیا ہے اسی لئے اس کتاب میں کچھ روایتی افسانوں کے ساتھ ساتھ کچھ خوبصورت جدید افسانے بھی قاری کو اپنی جانب متوجہ کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

اس افسانوی مجموعے میں ایک ایسا افسانہ بھی شامل ہے جسے انگوٹھی میں نگینے کا درجہ عطا کیا جا سکتا ہے اور وہ افسانہ ہے ''کتھ منز کتھ'' (بات میں بات) جس کے آخر

میں افسانہ نگار کا فن اس انداز سے اپنے معیار و معراج کا مظہر دکھائی دیتا ہے کہ دل کے نہاں خانوں سے بے ساختہ واہ نکلتی ہے۔ اس مقام پہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ایک فنکار نے ایک پتھر کو تراش کر ایک انمول ہیرا بنا دیا ہے۔ یہ افسانہ خود ایک تاریخ ہے اور اس افسانے میں قلمکار ویریندر پٹواری پہ مائیگرنٹ ویریندر پٹواری کہیں بھی حاوی ہونے میں کامیاب نہیں ہوا ہے حالانکہ اسی کتاب میں کہیں کہیں کچھ جذباتی کردار سستے نعرہ باز بھی لگنے لگتے ہیں جن کے ہونٹوں پر کبھی کبھار اُن کی اپنی ماں ہاتھ رکھ کر یہ فریاد کرتی ہوئی نظر آتی ہے ''بیٹے کیا اپنی ماں کو اب ان مائیگرنٹ کیمپوں میں بھی سکون سے رہنے نہیں دو گے'' لیکن ....

''کتھ منز کتھ'' افسانے کا ہر کردار یہاں تک کہ وہ ''پچھ'' (ایک جانور) بھی ان ہی مائیگرنٹ کیمپوں میں اپنی بے بسی اور معصومیت کا احساس دلاتا ہوا قاری کو ایک آہ بھرنے پر مجبور کرتا ہے اور یوں اس بات کا بھی عندیہ ملتا ہے کہ کس طرح اس افسانے کے تخلیق کار کو اپنی ہی شہہ رگ پہ اپنی قلم کی نب گھسنے کا فن آتا ہے۔

''علم'' کتاب کے سارے افسانے اپنی اپنی جگہ۔ یہ معیاری افسانے ہیں اور یہ بات بھی مسلم ہے کہ فاضل افسانہ نگار کو کشمیری زبان پہ بھی اُتنی ہی دسترس حاصل ہے جتنی اردو زبان پہ۔ کتاب لایق ستایش بھی ہے اور لایق مطالعہ بھی۔ ☆☆

اقبال شہیدؔ کا شعری مجموعہ

''رُوٗح تہٕ رِیاض''

(ایک نظر)

اقبال شہید کے شعری مجموعے ''روح تہ ریاض'' (روح اور ریاض) پڑھتے ہوئے نہ جانے میرے ذہن میں یہ خیال کیونکر اُبھر آیا کہ جب ایک قلم کار اپنی حسرتوں، اپنے حادثوں اور تجربوں کا احاطہ کر کے اُسے لفظی پیکر عطا کرنے کی جسارت کرتا ہے تو دوسرے کو یہ کیا سوجھتی ہے کہ وہ اُسکے احساسات کو نشتر زنی کا شکار بنادے۔ اپنے جنون کو وہی انسان بہتر طور پر زبان لفظ اور انداز عطا کرسکتا ہے جو اُس جنون کی حرارت کا اسیر ہو۔ جو تخیل جس کے ذہن میں Concieve ہوتا ہے وہی اُسے بہتر طور پر جنم دے سکتا ہے۔ ڈاکٹر کسی نومولود کے بارے میں خون کی کمی یا شکل وصورت کی خامی کا اشارہ کرسکتا ہے لیکن جنم دینے والی عظیم تخلیق کار ماں کی نظروں میں اُسکا سانولا بچہ بھی کسی گورے شہزادے سے کم نہیں ہوتا۔

مجھے یہ کتاب پڑھتے ہوئے ایسا لگا کہ اقبال کے اندر بھی کوئی سونامی موجزن ہے تبھی تو وہ خود کو تاریک گوشے کا اسیر بنانے کے بجائے متاع بازار بنانے پر تُلا ہے۔

تارکن منزژ نحقہ راوی پان مارکن منزژ کاروان بنکھ

(تم کہکشاں میں کھو جاؤ گے۔ زمین پہ آو، اک کارواں بن جاوگے)

اقبال شہید کو اس بات کا بھرپور احساس ہے کہ شعری مجموعہ لیکر منظر عام پہ آنا اور ''صاحب کتاب کارواں'' میں شامل ہونا کوئی آسان کھیل نہیں۔ اُسے اس بات کی بھی آگہی ہے کہ اس ایوان خاص میں اُسے مقتدر نقادوں، اعلیٰ پائے کے ادیبوں اور شعر پڑھنے اور سمجھنے والے قاریوں کی تلخ تند اور شریں باتوں کا بھی سامنا کرنا پڑے گا۔ شہید کو اس بات کا بھی احساس ہوگا کہ آج کے ''کشمیری ادبی ماحول'' کا رنگ کیسا ہے۔ وہ اس سفر میں برسوں سے آبلہ پائی کا درد سہتے ہوئے رواں بہ منزل ہے۔ پڑھنے والے کو تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس انسان کے اندر کوئی نامعلوم سی خلش، کوئی تشنہ لب آرزو، کوئی بے تاب خواہش اور کوئی جان لیوا درد ہچکولے کھاتے ہوئے اسے اپنے حال کی ترجمانی کرنے کی ترغیب دیتا رہتا ہے اور اس عالم محشر میں وہ خود اپنے آپ کو تپتے لفظوں کی تپش بھری چبھن سہنے پر مجبور کرتا ہے۔ وہ کبھی خوشبو کا دیوانہ لگتا ہے تو کبھی گل بلبل کی داستان کا ایک کردار۔ حد یہ کہ اُسکی خاموشی بھی کبھی اُسکی ترجمان بنتی ہے۔

گولاِ بچ زیوانن بلبل ہٹس منز خموشی کیاہ چھ ازماوتھ کتھاہ کر

(بلبل کی زبان سے گل کا نغمہ گانا خاموشی کو آزما کے دیکھ، تب کچھ سنا)

کتاب پڑھتے ہوئے کبھی کبھار قاری قلم کار کو کسی ویران، سنسان کوچے میں دبے قدموں چلتے ہوئے پُراسرار طریقے سے کسی دروازے پر دستک دیتا ہوا بھی دیکھ لیتا ہے۔ جیسے وہ کسی کو خواب غفلت سے جگانے کی سعی کر رہا ہو۔ اس عالم تصور میں وہ کبھی عبدالاحد آزاد کے لباس میں دکھائی دیتا ہے اور کبھی مہجور کے پیراہن میں۔

اسہ چھ آزاد آسمان پۆز غولامی ہنز زمین لونچہ کبتھ رٹہٕ مژتھہ رینہ ونکھ کینہہ مارنے

(ہمارا آسماں آزاد ہے پر زمیں غلام

ہم نے جھولی میں خیرات لی ہے بس چپ رہو ورنہ مارے جاؤ گے)

اقبال شہید کے عالمِ اندروں میں اگر اُسکے تخلیقی سفر کے تناظر میں جھانکا جائے تو وہاں ''شاہ یندرراز'' کا ایک سجا سجایا دربار بھی نظر آتا ہے اور عالمِ فنائی کا ایک لامحدود ''خلا'' بھی... ایک ایسا خلا جو زمان و مکاں سے پرے ہے۔ کبھی کبھی اُسکے کوچہ دل میں کسی کے پایل کی جھنکار بھی سنائی دیتی ہے اور کبھی چوڑیوں کی کھنک بھی لیکن یہ بات بھی صاف ہے کہ کہیں کوئی مجازی پیکر نظر نہیں آتا۔

میں نے جب کشمیر کے ایک مایہ ناز لیکن جوان مرگ شاعر پر مبنی فلم ''رسول میر'' لکھنے کے دوراں اُسکی زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی تو مجھے اُسکی افسوسناک لیکن درخشاں زندگی میں شامل اُسکی محبوبہ ''کونگ'' بھی عشق حقیقی کی ہی ایک علامت نظر آئی۔ مجھے رسول میر، بے نیاز، بے پروا اور اپنے جنون کا مارا ایک ایسا کردار نظر آیا جو اپنے عشق میں ''کوٹھوں'' پر بھی دکھائی دیتا ہے۔ ساگم اور برنگی (کشمیر کے دو گاؤں) کے لالہ زاروں اور پتھریلے میدانوں میں آبلہ پائی کا شکار ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور کبھی تارہ بلی صاحبؒ (ایک روحانی بزرگ) کی شمع جلال و جمال کے اردگرد پروانہ وار رقص کرتا ہوا بھی نظر آتا ہے۔ اسی لئے شاید میں نے رسول میر کے اُس کردار کو فلم کے سلولائڈ پر ''مجازی'' علامت کے طور پر نہیں اُبھارا۔ وہ ہمیشہ میری نظروں میں ایک ایسے عاشق کی مانند منعکس رہے گا جو ''یا فتاح'' کا ورد کرتے ہوئے ''پل صراط'' کا پار کرتا ہے۔

رسُل چھُ زانتھ دین مذہب، رخ تہٕ زُلف چانٕے:

کیاہ زانہ کیاہ گو کفر تے اسلام نگارو

(رسول میر دین و مذہب کو تمہارا رخ روشن اور تمہاری عنبریں زلفیں سمجھتا ہے

اُسے کیا معلوم میرے محبوب کہ کفر اور اسلام کیا ہے)

اور اقبال شہید کا یہ کہنا۔

کفرتہٕ اسلام چھے زندگی میأنی سُہ نور ظلمت سُہ رُخ زُلف چون

چُھ ٹوٹھ رِندس گناہ تِتھُے ہیؤ وچُھ زاہدس یُتھ ثواب راوُن

(کفر اور اسلام میری زندگی ہے۔ تمہارا وہ نور، تمہاری وہ سیاہ زلفیں

رند کو گناہ سے اُتنی ہی رغبت ہے جتنی زاہد کو ثواب سے)

یہ شعر پڑھتے ہوئے ایسا لگتا ہے کہ جب شہید کے دلِ مضطر کی تاروں کو کوئی خیال چھیڑتا ہے تو وہ رسول میر کی طرح عشق کی آگ میں جلنے کے خود ہی سامان مرتب کرتا ہے۔ اُس عالم میں وہ جو کچھ بیان کرتا ہے وہ ایک ایسے عالم کی تصویر کشی کرنے کی جستجو ہوتی ہے جس کا احاطہ نگاہ آدم سے بعید ہے

زیوِ پیٹھ چُھ قلمس معنہِ دلُک خون بران رنگ

شاعر شہیدس نش پران افسانہٕ أ زِچ راتھ

(قلم کی زباں کو دل کی بے تابیوں نے اپنے لہو سے رنگ لیا ہے

شہید شاعر کے پاس آج کی رات ایک افسانہ بیان کر رہی ہے)

اقبال کی شاعری میں یوں تو بہت سارے رنگ ہیں، جن میں سادگی کا حسن بھی ہے۔ خاص طور سے شاعر کے دل میں ایک ایسا درد پنہاں ہے جسکی ندا دور دور تک گونجتی ہوئی سنائی دیتی ہے۔ اس عالم میں یوں لگتا ہے جیسے شاعر جیتے جی اُس دار و رسن کو چومنا چاہتا ہے جس کی رسی ابھی بھی لٹک رہی ہے۔

چھُنہ قصہ کانٛہہ یتہِ لیلی مجنوٗن یہ چھِ ووڈٕ ننی کاشُرحبہ خوتوٗن

بیع نامہ لیکھتھ کتہِ گہنہ دِنے کم نو کتہ ونے سُرِ تالن منٛز

(یہ کوئی لیلیٰ مجنوں کی داستاں نہیں۔ یہ داستاں ہے ننگے سر کشمیری حبہ خاتوں کی

اب ''بیعہ نامہ'' لکھا جا چکا ہے، اب زیورات نہیں ملنے والے

آ تمھیں سرتال میں کچھ نقطے بتادوں)

اقبال کبھی حدنگاہ سے گزر کر انسانی شعور کو احساس کی ایک ایسی رمق اس انداز سے عطا کرتا ہے کہ لگتا ہے اُسکی نظر کے سامنے آنے والے کل کا ایک پورا منظر رقصاں ہے

پُر امن وِ بتھ ژِ چھکھ پکان خاموش

یُد گژھکھ تنگ ژٕ کیاہ طوفان بنکھ

(پُرامن جہلم تو خاموشی سے اپنا سفر پورا کر رہا ہے

اگر تم زرا سے تنگ دامنی کے شکار ہوئے تو نہ جانے کیا طوفاں بپا کر دو گے)

''روح تہ ریاض'' پڑھتے ہوئے ایسا لگتا ہے کہ شہید، علامہ اقبال سے بھی متاثر ہے۔ اور بھری بھیڑ میں عبدالاحد آزاد اور مہجور بھی اُسکا نام پکارتے ہوئے اُسے دکھائی دیتے ہیں:

مٛیہ کیاہ دامنس چونہِ تارکھ نباہ زن

یہ کراوس نظرن مٛیہ پرواز آمٕت

(میرے دامن پہ یہ تارے کیسے جُڑے ہوئے ہیں

یہ کب میری وسعت تخیل کو پرواز کی سعادت نصیب ہوئی)

اقبال کی اس کتاب میں چھپی ریاضت کس کس کی روح کی گہرائیوں تک اُتر آئے یہ دیکھنا وقت کا کام ہے مجھے اُمید ہے کہ اقبال کی یہ عرق ریزی ضایع نہیں ہوگی کیونکہ وہ خود

اعتمادی کے ساتھ ساقی کو خود اپنی سیرابی کا احساس دلا رہا ہے:

وُچھ سہ وفٕھک دراوتر۔ اوش قطرہ کانٕہہ پیوگوٚ وشہیدؔ

ووٚنی گرٕنی چھِے پڑھ اُدُور دامانہٕ ہاوے ساقیاہ

(دیکھ میری وفا کا ثمر، میرے اشک گرے اور عروض پا گئے

اب تم بھی یقین کرلو ساقی میں تمہیں اپنی تر دامنی کا مشاہدہ کرا رہا ہوں)

''روٗح تہٕ رِیاض'' میں ''الوداع'' نام کی نظم اقبال شہیدؔ کی پوری زندگی کا احاطہ کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ایک آدم۔ ایک خوشہ گندم، ایک سہو خطا کی لغزش، ایک تلخ سچائی۔ ایک خواب اور ایک سراب۔ اقبال شہیدؔ نے واقعی اس نظم کو لکھنے کے دوران خونِ جگر میں اپنی اُنگلیاں ڈوبوئی ہیں۔

''روٗح تہٕ رِیاض'' کی طباعت میں اقبالؔ نے جس طرح سے اپنی وسعت قلب کا مظاہرہ کیا ہے وہ قابل تعریف ہے تبھی تو یہ کتاب دیدہ زیب بھی ہے اور اعلیٰ طباعت کی ایک خوبصورت مثال بھی ☆☆

(نومبر ۲۰۰۵ء)

عشاق کشتواڑی کا مجموعہ کلام

''رُودادِ کشمیر''

ایک نظر میں

شاعری حسن کی مرہون ہے.....شاعری حسین رنگوں کا ایک کولاج ہے۔...شاعری میں شاعر کا دل دھڑکتا ہے.....شاعری اپنی زبان، اپنا گرائمر، اپنا تخیل خود لیکر وارد ہوتی ہے.....شاعری ایک انقلاب ہے..شاعری ایک ارتعاش ہے..شاعری جنون ہے...شاعری فنون لطیفہ کا ایک دل چھو لینے والا لمس ہے..........

میں اپنی ادبی آبلہ پائی میں ابتدا سے یہی سب کچھ سنتا آیا ہوں..اسی اشتیاق نے مجھے کبھی فیض کی کتابوں میں گم کر دیا اور کبھی اقبال کے اسرار میں...کبھی مہجور کے ہاتھ میں مجھے ایک سیاسی طبلہ نظر آیا اور کبھی آزادؔ (عبدالاحد آزاد) کی نس نس میں موجزن ایک انقلاب...اسی شوق نے مجھے میر و غالب کے فن سے آشنا کیا اور کبھی بشیر بدر کی خوبصورت شاعری سے ہم کنار..یہی جنون مجھے راحت اندروری کا گرویدہ بناتا ہے اور یہی اُنس مجھے عشاق کشتواڑی کے ایک مختصر سے شعری مجموعے کا قاری بننے کا موقع عطا کرتا ہے۔

''رو داد کشمیر'' ایک ایسا موضوع ہے جس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور بہت کچھ لکھا جائے گا...لیکن جہاں تک اس موضوع کو شاعری کی مالا میں دانہ دانہ پرونے کی بات

ہے تو پھر ایک شاعر کو اپنے نظریے سے ہٹ کر.. اپنے لفظوں کے بطن سے معنی کے نئے گوہر تلاش کر کے قرطاس پہ اپنے احساس کو اُجاگر کرنا ہوگا.. خوبصورت شعر خود اپنی زباں سے وہ دردناک منظر پیش کرتا ہے جو شاعر کی تیسری آنکھ دیکھتی ہے......لیکن جب شاعر بھی عام لوگوں کی طرح یا ایک مخصوص نظریے کے تحت ظاہری طور پر دو آنکھوں سے ہی کام لے تو پھر شاعری اور نعرہ بازی میں کوئی خاص فرق نہیں رہتا...اس کا کیا کیا جائے کہ آج کل نعرے بھی بڑے Rythemic ہوتے ہیں.....

روداد کشمیر کے مصنف نے جہاں ایک طرف ''کشمیر کا درد'' سہا ہے وہیں اس درد کو بیان کرتے کرتے وہ اپنے تخلیقی عنصر سے کام لینے کے بجائے کہیں کہیں پہ عروض کی بندشوں کے شکار ہو کر ''تک بندی'' تک پہنچ گئے ہیں.....

دشمن کشمیر سرحد پار سے چونکا ہے پھر
اُس نے اپنے ہمنواؤں کو یہاں جھونکا ہے پھر
آؤ اس کو پھر دلا دیں یاد پچھلی مار کی
اُس نے خود ہی دے دیا ہے آج یہ موقعہ ہے پھر

عشاق صاحب کا شعری کتابچہ ''روداد کشمیر'' اپنے انتساب سے ہی اس بات کو اظہر من الشّمس کر رہا ہے کہ وہ اس کتابچے کو نہایت ہی عجلت میں اپنے دو محبوں کے نام انتساب کر کے ''قصیدہ گوئی'' کی حد تک اُن کی مداح سرائی کر چکے ہیں......

اس کتابچے میں عظمت کشمیر کے بارے میں اُن کے دو اشعار اُن کی محبتوں کے عکاس ہیں

اے وطن اے غیرت گلزار تجھ کو صد سلام سجدہ گاہ سُنت و زنار تجھ کو صد سلام

نازکرتی ہیں تری صورت پہ حورانِ بہشت

حُسن فطرت کے بھرے بازار تجھ کو صد سلام

عشاق صاحب کو زباں پہ دسترس حاصل ہے...وہ خوبصورت غزلیں قلمبد کرتے ہیں..اُن کے اندر ایک حساس قلمکار انگڑائیاں لیتا ہوا نظر آتا ہے لیکن روداد کشمیر کتابچہ اُن کے یہ اوصاف کسی بھی طور سے جلوہ گر نہیں کرتا.........اُن کی خوبصورت شاعری کا ایک نمونہ جو انہوں نے مجھے ایک خط میں ارسال کیا تھا خود میری بات کی تصدیق کرتا ہے.....

اب نہیں بھاتی اس کو زعفراں زاروں کی بات

حادثوں نے جب سے اُسکا ہے اجاڑا گھر تلک

رات بھر تاروں سے محو گفتگو عشاق تھا

دھوپ کا پھر قافلہ پہنچا ہے اُسکے در تلک

مجھے امید ہے کہ عشاق بھائی کے دھوپوں کا یہ قافلہ ہماری نظروں کی دہلیز تک بھی ضرور پہنچے گا اور ایک خوبصورت شاعر کی دل کو چھو لینے والی شاعری کا ایک خوبصورت گلدستہ ہمیں عنقریب دیکھنے کو ملے ....خدا اُنہیں تخلیقی ادب کے سمندر سے بہرور فرمائے۔ہم تو یہی دعا کرینگے ۔

خدا تمہیں کسی طوفاں سے آشنا کردے

کہ تیری بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

(اقبال) ☆☆

سیدہ نصرین نقاش کا شعری مجموعہ

''دشت تنہائی'' پر ایک نظر......

....سیدہ نصرین نقاش کا شعری مجموعہ ''دشت تنہائی'' خوبصورت نظموں سے مزین ہے۔ یہ نظمیں ''دشت تنہائی'' کی عکاس ہیں۔ان میں چھپے احساس ''صلیب'' پہ لٹکتے ہوں یا 'دو کنوارے ہاتھوں'' کی داستان بیان کر رہے ہوں۔امن کے دیوتا سے آشیرواد مانگیں یا موسم موسم کہانیاں۔سب ایک اچھی خاصی داستان کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں ۔''گستاخی'' پڑھتے ہوئے ''مرحوم ساحر لدھیانوی'' کی یاد آتی ہے۔ ''جواب'' جہاں شعری نزاکتوں کا امین ہے وہیں ''شام کے سائے'' کشمیر کی حالت زار کا عکاس لگتا ہے۔''سانحہ'' اور روز سیاہ... چوٹیں ہیں انسانی پستیوں پر۔مجموعے میں شامل غزلیں بھی اپنے اندر ایک درد و غم چھپائے ہوئی ہیں۔دنیائے بے ثبات کا یہ عالم جو آنکھوں کے سامنے گردش شام و سحر کا عکاس ہے جب ایک حساس شاعر کے رگ و پے میں ایک چھبن بن کر سرائیت کرتا ہے تو ایسی غزلیں جنم لیتی ہیں۔شاعرہ کی زبان سادہ ہے۔اشعار ترنم ریز جبکہ نسوانی کیفیت کے عکاس بھی۔یہ شاعرہ کو ایک بھری بھیڑ میں Highlight کرتا ہے کیونکہ شاعری محض لفظوں کی سجاوٹ، خیال کی بندش اور ترنم کی آراستگی کا نام نہیں بلکہ شاعر شعر کہنے کے دوران اپنے کلیجے کو منہ میں محسوس کرتا ہے۔کبھی اُسکی ایک بحر اُسکے درد کا درماں بنتی ہے اور کبھی ایک قافیہ اُسکے آنسوؤں کا ایک قطرہ بن کر اُسکے رخسار کو تر کرتا ہوا صفحہ قرطاس پہ اپنی ایک ان مٹ کہانی چھوڑ جاتا ہے۔اور اس مجموعے میں شامل بیشتر شاعری انہیں کیفیات کی غماز ہے۔☆☆ (۲۰۰۶ء)

در جوابِ آں غزل

محترم سید رسول پونپر صاحب کا تبصرہ

(چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسدؔ)

''ادبی دنیا ہو یا سماجی کائنات، بزرگ، صاحب علم اور زیرک و دانا اشخاص کی اپنی ایک قدر و منزلت ہوتی ہے۔ اُن کے فرمودات اور اُن کے شہہ پارے دونوں اپنی جگہ ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں اور یہی اہمیت میرے لئے ہر صاحبِ فن اور اہلِ قلم فرد کے آرا کی ہے۔ اور میں ان آرا کو اپنے لئے کسی اعزاز سے کم نہیں سمجھتا لیکن یہ بات بھی اظہر من الشّمس ہے کہ ہر شخص کا اپنا ایک نقطہ نگاہ ہوتا ہے۔ اور اسی زمرے میں ہر محقق اور ہر نقاد کے کارہائے نمایاں بھی آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ادبی زندگی کی جتنی بھی تنقیدی اور تواریخی آرا منظر عام پہ آئی ہیں اُن میں کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی نقطے میں تضاد ہے اور میں اس بات کا قائل ہوں کہ تحقیق تضاد کی ہی مرہون ہے۔''

یہ وہ خیالات تھے جو مجھ ناچیز اور طفل مکتب کی نگارشات پر محترم پونپر صاحب کی گراں قدر آرا پڑھنے کے بعد میرے شعور کی گزرگاہ پہ اپنے دبے قدموں کی آہٹ سُنانے لگے۔ میں اُن کی بے لوث اور مخلصانہ آرا کا بہ سر چشم احترام کرتا ہوں لیکن کیا کروں بقول اُنکے اپنی سیمابی فطرت سے مجبور ہوں. اور اللہ نے مجھے پُر اسرار طریقے

سے گڑھ لیا ہے۔ روایت شکن ثابت ہو کر تنقیدی جائزے کا تنقیدی جایزہ لینے بیٹھ گیا تو کچھ متضاد باتیں کچھ غور طلب اور تشریح طلب جملے آنکھوں کے سامنے گردش کرنے لگے۔ کچھ مندرجات پہ اپنی حقیری سی آرا ضبط تحریر میں لانے کی گستاخی کر رہا ہوں تا کہ اپنی جانب سے یہ اطمینان رہے کہ میں نے اپنی مطبوعہ کتابوں میں جو ''ذاتی آرا'' بیان کرنے کی کوشش کی ہیں وہ ترسیل کی ناکامی کی شکار نہ ہوں۔

پوَنپر صاحب اپنے مدلل تبصرے میں رقم طراز ہیں کہ میں نے اپنی ذاتی زندگی کے اُس پہلو کو چھیڑا ہی کیوں جس کو میں نے (بقول اُنکے) کچھ پنہاں اور کچھ عریاں کرنے میں کسی مصلحت سے کام لیا ہے۔ خاص کر انہوں نے ہمارے چینی چوک والے گھر سے نکلنے کی بات کو اس ضمن میں زیر قلم لایا ہے (حالانکہ دیکھا جائے تو انہوں نے میری آتم کتھا اور برق تخیل دونوں کو غیر ضروری قرار دیا ہے)

بہر حال اس سلسلے میں ادبی دیانتداری کا یہ تقاضا نہیں ہے کہ میں نئے سرے سے کچھ اضافہ کر کے یا جملوں اور لفظوں کے اُلٹ پھیر سے اُن کے اس نکتے کے جواب میں بے جا بحث کو ضبط تحریر میں لاؤں، میری کتاب ''سلگتے چنار'' کے صفحہ نمبر ۸ کا وہ پیراگراف خود اس بات کا غماز ہے کہ بچپن میں جھیلے ہوئے ایک دل شکن سانحے کا ذکر کرنا مطلوب تھا کیونکہ اپنے آبائی گھر سے نکلنا (وجہ کوئی بھی رہی ہو) ایک انسان کی زندگی میں ایک تلخ یاد بن کر ہی رہتا ہے اور انسان جب اپنے اُس رستے ناسور کا ذکر کچھ اس انداز سے کرے......

''.......زندگی کے جس سفر میں خالق کائنات نے مجھے بھی ذروں کے کارواں میں شامل کیا تھا اُس سفر میں اگرچہ زندگی کی تمام تر رعنائیاں موجود نہ تھیں لیکن زندگی،

بے رنگ و بے نور بھی نہ تھی۔ بچپن کی سرحدوں میں جب میں نے انگڑائیاں لیں تو یوں لگا
کہ عالم اپنی تمام تر نوازشوں کے ساتھ بانہیں پھیلائے منتظر ہے لیکن دن گزرنے کے
ساتھ ساتھ وہ ایک سراب دکھائی دیا۔ایک دن ہمارا سب کچھ اُجڑ گیا.....

(سلگتے چنار صفحہ نمبر ۸ پیراگراف :۳)

اب یہ کہاں کی مسیحائی ہے کہ بربادی کے زخم کریدنے والے سے یہ کہا جائے کہ
آپ بربادی کے مفصل پوسٹر بھی چھپوائیں۔۔ میں اُس واقعے کے ابتدا میں بس یہ کہنے کی
کوشش کر رہا ہوں کہ....

''.....میں نے بچپن سے ہی اپنی زندگی میں ناانصافی کے وہ نظارے دیکھے ہیں
کہ شاید اُنکے ہی ردعمل میں میرے قلم کو یہ قوت عطا ہوئی کہ میں نے کبھی نثر، کبھی نظم اور
کبھی صحافت کے میدان میں اپنا لہو گرم رکھنے کا بہانہ تلاش کیا، کیونکہ میرے اندر کا مختار
مجھے کبھی بھی خاموش تماشائی بننے کی ترغیب نہیں دیتا تھا۔.....

(صفحہ نمبر ۸ ''سلگتے چنار'' پیرا :۲)

یہ تحریر اس بات کی دلیل پیش کرتی ہے کہ میں محرکات کا ذکر کر رہا تھا اور محرکات
کے پس پردہ عوامل کا تذکرہ اپنے ادبی سفر کی مختصر روئداد میں بیان کرنا نہ میں نے
مناسب سمجھا اور نہ ہی موزون، ناانصافی کا وہ دور اپنے تمام تر نقوش چھوڑ کے کب کا
گزر چکا ہے۔ یادِ ماضی کا ذکر آتے آتے ہی آیا ہے اس لئے اسے ایک مدلل باب بنانے
کی نہ کوئی ضرورت تھی اور نہ ہی کوئی اہمیت۔ میری سمجھ سے یہ بات بھی بالاتر ہے کہ
میرے بچپن کا یہ دل شکن حادثہ بھلا کسی کو کیوں شکوک وشبہات کا اسیر بنادے میں نے تو
کم از کم کسی کی جانب کوئی انگشت نمائی نہیں کی ہے، واللہ ہو عالم

میرے قلم کی نوک پر یہ الفاظ اس لئے تڑپنے لگے تھے کہ:

تازہ خواہی داشتن گر زخم ہائے سینہ را　　گاہے گاہے باز خواں ایں قصہ پارینہ را

اب ذرا اُن کے اس جملے کے بطن میں چھپے ایک کلبلاتے نقطے کی جانب غور کریں۔ محترم پونپر صاحب رقم طراز ہیں...

''.......زندگی انسان کو خاصکر تخلیق کار کو حوادث و تجربات کی شکل میں بہت کچھ دیتی ہے لیکن سب کچھ ضبط تحریر یا تخلیق کی صورت میں لوٹانے یا لانے کی ضرورت نہیں ہوتی.......''.

اس جملے کی دلیل میں اُنہوں نے جو مثال میرے ہی ایک جملے سے دینے کی کوشش کی ہے اُس کا موضوع بلکل مختلف ہے جو اُن کی اس آرا کے لئے کسی بھی حال میں مددگار ثابت نہیں ہوسکتا۔ میں اُس جملے کو (مثال کے طور پر یہ کہنا کہ جو جتنا بارسوخ ہے وہی بڑا ادیب ہوتا ہے) الگ سے زیر بحث لاونگا۔ فی الحال اُن کی اس دلیل سے اتفاق نہ کرتے ہوئے بس اتنا کہہ سکوں گا کہ مشہور شاعر ساحر لدھیانوی اس ضمن میں رقمطراز ہیں۔

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

''یادوں کے فانوس کے بارے میں میرے کچھ ہم عصر قلمکار دوستوں کا کہنا ہے کہ

''زاہد نے اپنے اُس ادبی حلقے کی ایک تواریخ مختصراً ہی سہی قلم بند کر کے ایک کار نیک انجام دیا ہے جس ادبی حلقے کے بارے میں یہاں کے محقق بہت کم لکھنا گوارا کرتے ہیں''

محترم غلام نبی ناظرؔ صاحب کا کہنا ہے کہ'' زاہد نے اپنی زندگی کو معروضی صورت میں سامنے لاکر صداقت کا دامن تھامے ہوئے ایک تفصیلی خاکہ اس کتاب میں ''یادوں کے فانوس'' کے عنوان کے تحت قاری کے سامنے رکھا ہے جسکی وساطت سے اُسکے ذہنی، تصوراتی اور احساساتی دنیا کے مختلف جلوے قاری کے سامنے یکے بعد دیگرے عیاں ہو جاتے ہیں اور اس واقعاتی تفصیل و ترتیب کی روشنی اُسکی شاعری کی حدود اور وسعتوں کے بارے میں بہت حد تک اطلاع بہم پہنچاتی ہیں''

میرے ایک ہم عصر قلم کار دوست عطا محمد میرؔ اس بارے میں رقم طراز ہیں ''یادوں کے فانوس'' زاہدؔ صاحب کی جرات مندی کا غماز ہے ، یہ ''پدرم سلطان بود'' سے کوسوں دور ایک جدو جہد کرنیوالے شخص کی داستان ہے کہ وہ زندگی کو کس طرح دیکھتا ہے، محسوس کرتا ہے گزارتا ہے اور اپنا نام بناتا ہے۔ اس کے بعض جملوں نے مجھے کبھی اشکبار کیا ، کبھی حوصلہ دیا اور کبھی زندگی سے آنکھ ملانے کی تحریک دی۔ ان صفحوں میں ہمیں ہمارا بچپن نظر آتا ہے ''

اب میں اُن کے اُس اعتراض کی جانب آتا ہوں جو اُن کے تبصرے میں کئی بار مختلف النوع کے ساتھ ضبط تحریر میں آکر اس بات کی دلیل پیش کر رہا ہے کہ اُنہوں نے بلواسطہ یا بلا واسطہ میرے اُس ادنیٰ سی آرا کو اس بات سے جھٹلانے کی کوشش کی ہے کہ

ایں سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشند خدائے بخشندہ

اُنہوں نے فرمایا ہے کہ'' اتنے اہم اور حتمی فیصلے ادب اور شاعری کے میدان میں نہیں دئے جاتے'' .. میں ضمناً وہ پورا پیراگراف یہاں نقل کرتا ہوں تا کہ مجھے اپنی بات واضح کرنے کا موقع ملے۔.......... میں سلگتے چنار صفحہ نمبر (۳۰) پر یوں رقم طراز

ہوں

"............اب یہاں ادیب رہتے ہیں ، قلم کے جادوگر رہتے ہیں ، خوبصورت شاعر رہتے ہیں، غضب کے افسانہ نگار رہتے ہیں ، اعلیٰ پایہ کے ڈرامہ نگار اور صحافی رہتے ہیں لیکن صاحب دل کہاں گئے کوئی علم نہیں ، وارداتِ روز و شب کو، سانحوں اور حادثوں کو، ظلمتوں اور ضیا پاشیوں کو سب نے متاع دکان بنا دیا ہے، ان میں کوئی کسی کی خبر نہیں رکھتا ، کوئی یادوں کے گلشن نہیں مہکاتا، کوئی خلوص کی آبیاری نہیں کرتا، نہ کوئی کسی سے بنا مطلب کے ملتا ہے اور نہ کوئی اب کسی کو خط لکھتا ہے، سب اچھے برے، ادنیٰ اعلیٰ، چھوٹے ،بڑے ادیب ہیں صرف ادیب ۔ جن میں اکثر دوردرشن کے منڈی ہاؤس سے ریڈیو کشمیر کے ڈیوٹی روم تک ، کلچرل اکادمی سے لیکر ساہتیہ اکادمی کی دہلیز تک جبہ سائی کو ہی اپنا فرض سمجھتے ہیں، ان میں کوئی کسی کا دوست نہیں ، رفیق نہیں، رقابت ہے تو حسد آمدن کی نہ کہ رشک فن کی، کہانیوں کا پلاٹ، شاعری کا تخیل اپنا ماتم آپ کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے ۔ حال یہ ہے کہ اب رام کے رتھ پر راون سوار دکھائی دیتا ہے اور اللہ کے منبر پر شیطان براجمان ، اب یہاں ابابیلیں لوٹ کے آئیں گی بھی یا نہیں ، کوئی جگنو کسی لمحے کو پاش پاش کر سکے گا یا نہیں کسے معلوم؟...."

اب ذرا مجھے کوئی یہ بتائے کہ اس پیراگراف میں میں نے کہاں پہ کون سا ادبی فیصلہ صادر کرنے کی جرأت کی ہے۔ میں انسانیت، خلوص، محبت، بھائی چارے اور انسانی قدروں کا رونا رو رہا ہوں ۔ اس بات پہ ماتم کناں ہو کہ ہمارے اچھے برے، چھوٹے بڑے سارے ادیب جو قلم کے جادوگر بھی ہیں، خوبصورت شاعر بھی ہیں، اعلیٰ پایۂ کے ڈرامہ نگار بھی ہیں۔ غضب کے افسانہ نگار بھی ہیں، نہ جانے صاحبِ دل کیوں

نہیں۔ کیونکہ یہ تحریر (۱۹۹۴ء) کے حالات و واقعات کے تناظر میں لکھی جا چکی ہے
جب کلچرل اکادمی میں سبسڈی کے نام پر کن ''قلمکاروں'' کو مراعات سے نوازا گیا وہ
سبھی جانتے ہیں۔ ریڈیو والوں نے کتنے لاڈلوں کو سنوارا اُس بارے میں بس ریڈیو کشمیر
کے وہ سکینڈلز یاد کیجیے جو اخبارات کی زینت بنے۔ اب بھلے ہی کسی کو کشمیر کی لتا مینگیشکر
بنا کر ''اونچی پہنچ'' کے طفیل اونچے اعزاز سے نوازا گیا، اور کسی کو اردو شاعری کا کشمیری
ترجمہ اپنی کلیات میں شامل کرنے کے باوجود ساہتیہ اکادمی کے اعزاز سے نوازا گیا۔
میں نہ سہی زمانہ خود کبھی نہ کبھی ''پہنچ'' اور ''بڑے ادیب'' ہونے کے تماشے کو منظر عام
پہ لاتا ہی ہے ———— ان تمام دل شکن ادبی تماشوں پہ اگر میں نے اپنی
''آپ بیتی'' میں تھوڑی سی شکایت بھری ''جگ بیتی'' بیان کی تو کون سا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔
میرے اخبار کو آسمانِ سیاست وادب کے کرگسوں نے نوچنے سے بھی عار محسوس نہیں کیا
اب اگر ذاتی لاگت پہ بنا کسی نام نہاد کلچرل ادارے سے مالی معاونت کی ایک حقیر رقم
حاصل نہ کرنے کے باوجود اپنی آواز کے ساتھ اوروں کی آواز بھی ملا دی تو میرے خیال
میں اسے تنقیدی نشتر کے بدلے حوصلہ افزائی کے دو جملوں سے نوازنا چاہئے تھا لیکن کیا
کروں اس قصیدہ گوئی کے دور میں میں خود اپنی ''تلخ نوائی'' کا عتاب سہہ رہا ہوں۔
میں ۱۹۸۴ء میں بھی اپنے اولین شعری مجموعے ''ابتدا'' کے پیش لفظ میں اس بات کی
نشاندہی کر چکا تھا کہ ....

....میں خاموش نہیں رہ سکتا، میرے ساتھ میرا قلم بولتا ہے، وہ قلم جو میرا اثاثہ
ہے، میرا غم گسار ہے، میری تنہائیوں کا ساتھی ہے۔۔ میں ''بولنے'' کے عیب سے بخوبی
واقف ہوں، مجھے معلوم ہے کہ میرا یہ عیب میری سرکوبی کا باعث ہوگا، میں سچ کی صلیب

پر لٹکا دیا جاونگا کیونکہ میں ابھی سے کانٹوں کی چبھن محسوس کر رہا ہوں"...
(شعری مجموعہ ابتدا ؛ نمبر ے : شاید کہ اُتر جائے ترے دل میں میری بات).

بہر حال محترم پونپر صاحب اسی پیرا میں ایک اور جگہ نشتر زنی کرتے ہوئے رقمطراز ہیں........."کہ پہنچ" اور "بڑے ادیب" کا مبہم کلیہ بالکل نا قابل فہم ہے۔۔ باصلاحیت تخلیق کار کی راہ میں کوئی بھی رکاوٹ کسی بھی صورت میں حائل نہیں ہو سکتی"......

میں اُن کے اس جملے کے دوسرے حصے سے اتفاق کرتے ہوئے، پہلے حصے کے جواب میں اتنا کہنا چاہونگا کہ اوپر بیان کیئے گئے نا قابل تردید شواہد اس بات کے غماز ہیں کہ میرا کلیہ نہ مبہم ہے اور نہ نا قابل فہم ۔۔

میرے افسانوی مجموعے کے بارے میں اُنہوں نے جن اصحاب کے نامِ گرامی تحریر کیئے ہیں اُن میں سے کچھ افراد نے میرے ان افسانوں کی تکنیک اور فنی لوازمات کے علاوہ موضوعات کے بارے میں اپنی آرا قلمبند فرمائی ہیں۔۔

اردو ادب کے ایک پُر وقار نام افتخار امام صدیقی (مدیر شاعر) کی شامل آرا میرے لئے کسی اعزاز سے کم نہیں

اردو دنیا کے جانے مانے افسانہ نگار ویریندر پٹواری، عمر مجید، نور شاہ اور مضمون نگار عطا محمد میر جس انداز سے رقم طراز ہیں (اُن آرا کو یہاں نقل کرنے کے بجائے کتاب کے دیگر صفحات میں پڑھا جا سکتا ہے)

ان آرا کے ساتھ اب محترم پونپر صاحب کی گراں قدر آرا میرے لئے باعث اعزاز ہے اور مجھے خوشی ہے کہ مجھے اُن جیسے اہل قلم لوگوں کی حوصلہ افزائی ملی ہے۔ ———————— ☆☆

Face in the crowd

"Alsafa" (English) : June 9,2001

Zahid Mukhtar, the day when his mother told him that his father has sold one of his woolen blankets to pay for his school fee. The lower middle class boy programmed his psycho-physique with a single word "Hard work" and his added parental blessings paid miraculous dividends. Later, Zahid Mukhtar who started his literary career as "Afsaana writer" in 1973 has come a long way adding more and more achievements to his resume from writing *"Kunner"* to *"Gharounde"*. He has got 58 serials to his name as a writer. A man with Midas touch later turned to poetry and at present is renowned actor, writer and poet.

These days he is working on a project *"Sulagtay Chinnar"* which is based on collection of his poetry and metaphorically related with his personal life as well as agonised picture of present day Kashmir and Kashmiris. He is planning to launch his video album and book "Sulagtay Chinnar" together with an ultimate aim of never misusing his pen, which he considers heavenly gift from Almighty Allah. His plans are to serve Kashmir and win the hearts of the Kashmiris as he says:

"Show the world that Kashmir is no less than any other region in the world......... *Yahan ke Zameen Kissi aasman say kam nahi"*

Alsafa wishes him all the best.

Sulagtay Chinnar

"On The Track" (English) : 16 May, 2005

...........**The book** named *"Sulagtay Chinar"* (Cindering Chinar) is a unique literary piece, which emphasis the Postcolonial era which was the era of awakening illumination and development of a particular mind set. The poet begins his versus with the tune of nostalgia *(old memories)* even the twilight reference to childhood renascence.

The tone is naturalistic and fused with new emerging

tradition of uncertain modernity, which is induced in poetry by developments of present age and milieu.

The unique characteristic to catch up with the poetic trends of the modernity are enough reason that Zahid Mukhtar is a poet of something different to communicate, if not new but he tells it with difference in his book *"Sulagtay Chinar"*

The resistance of elements are present in the book especially the treatment given to present years of turmoil in its variety of expression brings before us the picture which offers a different set of experience, not the experience of poet or elite but how a common, indifferent and detached person without any political prejudice or predilection has to communicate about resistance of years,

The book evokes in us the new kind of sensibility, which is rare in the verse literature available in Urdu language, written in Kashmir.

Miss you Zahid

Greater Kashmir: 25 December 2005

Weekly column (Sunday Salad) by Sheru

Not many people know that a writer, producer, director, poet, actor dramatist, calligrapher and journalist lives in south Kashmir district of Islamabad. The multi dimensional personality of the Zahid Mukhtar has always been a source of inspiration for Sheru.

Zahid (although he rarely does justice to the name) has been bestowed with great qualities by *Mukhtar-e-qul* but he has a week memory. He often forgets his friends. He has not attended *Darbar-e-sheru* for long but not to speak of friends Sheru does not forget his enemies as well....

.... One day the postman delivered an envelope. There were some photographs in it. There was an old man with coarse hair and *Chak Giraiban.* Sheru could not recognize the person immediately. However after some time Sheru could see a glimpse

in the photograph. What has happened to him? Has the past started haunting him-once again? But he is fully aware of the rasem-e-ulfat and cannot do silly things. He believes in dignity and honour. Anyway Sheru was shocked. But, a chit inside the envelope delighted Sheru. Zahid was busy shooting a serial for Doordarshan in Patnitop and had sent his photographs most probably to impress Sheru. Of course Sheru was impressed. But Sheru is sure he must not have shown those photographs to his wife. His wife also was a poetess. But after marriage she decided (rightly) to come out of the make believe world. She concentrated on her family. One day when Sheru asked his wife why she has confined herself to the kitchen ... she is witty as her husband is, she pointed towards her children and said" This is my *Ghazal* and this is my *Nazem*" May her *Ghazel* and *Nazem* live long.

Oh Sheru has forgotten to tell the readers about yet another quality of his friend. He is a very good painter/ sketcher as well. He can make your sketch in a jiffy. But he could not make Sheru's sketch in seven years. Is Sheru so *Bayanak* that an artist could not draw his sketch in seven years?

SULAGTAY CHINAR

depicts agony of Kashmiri people
Indian Express : Himalayan Mail: May 2 2001

.... the Anantnag based poet has just exposed his own life story of becoming a poet on a visual canvas while the book "Sulagtay Chinar" has been his ambition, a video album he says is the essential complement. "It is a complex saga of feelings about oneself as well as one's own land which is in turmoil." said Mukhtar, who has already been part of some 58 serials of Doordarshan Kandra Srinagar.

Mukhtar in his poetry has beautifully used river Jehlum as its metaphor for love and peace. One of the couplets from his ghazal

Qaleb main ger hosla haija kai Jehlum rook do
Phir kisi sarhed, kisi talwar ki batain karain

(No one has power to stop the flow of the Jehlum into Pakistan, and let us also like the Jehlum , not believe in manmade boundaries)

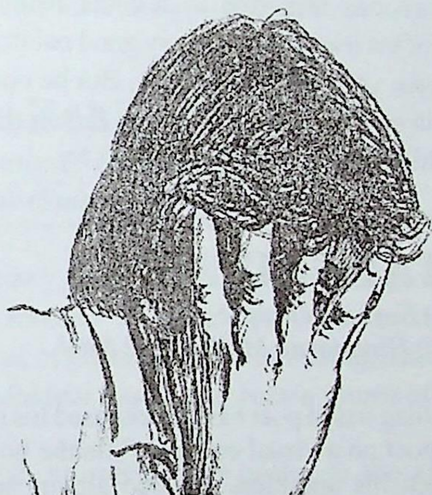
"It is about Love", said the author.

Though Jehlum flows across Kashmir Valley but Zahid Mukhtar shot the river in Anantnag for his Video Album.

"One can find original Jhelum here only. At other places various water bodies mingle with the river", reasons Mukhtar gives.

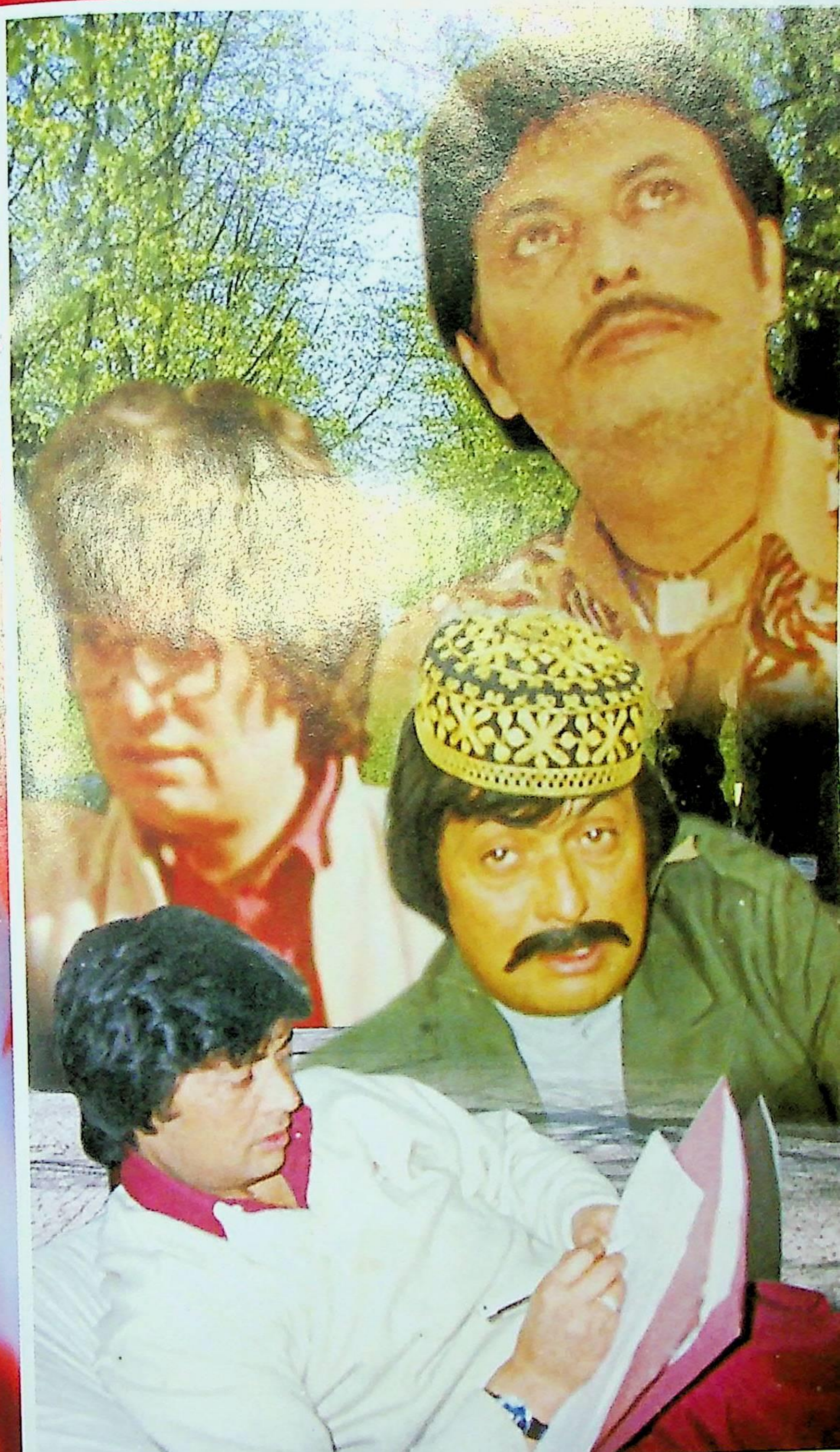
Zahid has started his career in the early Seventies as a freelancer with Kashmir Doordarshan.

Like others in the valley Zahid's heart too bleeds for love and peace.

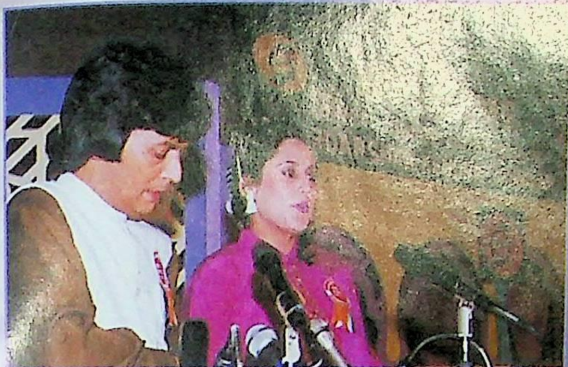


تم نہ آنا میرے خیالوں میں
میں ملونگا تمھیں سوالوں میں
یہ کہانی مری لکھی کس نے
میں اُلجھتا رہا سوالوں میں

آنچل میں چھپائے رکھتی تھی
ماں میرے ننھے بچپن کو








سرینگر ٹائمز — مہجور فاؤنڈیشن





TAHREERAIN

By

Zahid Mukhtar

مدت سے بھٹکی چھاؤں ہے کوئی چنار دے
مولیٰ مری زمین کو پھر سے بہار دے
جہلم کے لب ہیں پیاس کے صحرا لہو میں تر
ٹھنڈی ہوا سکون کی اِک آبشار دے
پھر زعفران کے کھیت میں خاتوں
خوشبو کو پھول ، پھول کو اک